سہ ماہی

صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

جلد: 1 شمارہ: 3 جنوری - مارچ 2025ء

علم و آگہی اور شعور و تربیت

مطلقہ کو عدت کے دوران میں اپنے شوہر کے گھر میں رہنا چاہیے اور شوہر کو بھی اپنی مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، شاید ان کے ایک دوسرے کے قریب رہنے سے اللہ تعالیٰ ان کے درمیان صلح کے امکانات پیدا کر دیں اور وہ پھر سے اکٹھے ہو جائیں۔ ایک ٹوٹتا ہوا گھر بچ جائے اور ان کے بچے دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کے الٹ ہوتا ہے۔ جس خاتون کو طلاق ملتی ہے، وہ اب شوہر کے گھر میں ٹھیرنا اپنی خودداری اور انا کے منافی سمجھتی ہے اور اس کے گھر والے بھی اپنی بچی کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اور شوہر تو پہلے ہی الزامات کا پلندہ اپنی مطلقہ پر لگا چکا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں خیر و برکت سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔

(عدت اور اس کے مسائل۔ کوکب شہزاد)

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

علم و آگہی اور شعور و تربیت

سہ ماہی صالحات

خواتین کے لیے

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

جلد: 1 شمارہ: 3 جنوری - مارچ 2025ء

مدیر: نعیم احمد بلوچ

نائب مدیر: وجیہہ حسان واحدی

مجلس ادارت

ارم نبی، بینش سلیم، ثوبیہ نورین، غزل چودھری، نکہت ستار

مجلس مشاورت

کوکب شہزاد، منیزہ ہاشمی، نسرین آفتاب، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر عظمیٰ عثمان

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

سہ ماہی
صالحات
خواتین کے لیے

علم و آگہی اور شعور و تربیت

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

نگران: حسن الیاس

فہرست مضامین

1۔	نکاح اور مہر کی حقیقت	استاد جاوید احمد غامدی	04
2۔	عورتوں کا محرم کے بغیر سفر	استاد جاوید احمد غامدی	07
3۔	غلطی ہاے مضامین مت پوچھ !	نعیم احمد بلوچ	10
4۔	عدت اور اس کے مسائل	کوکب شہزاد	13
5۔	ہمارے بزرگوں کا تصور عورت	محمد حسن الیاس	19
6۔	بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو	ثوبیہ نورین	22
7۔	اُمِّ موسیٰ: ایک بے مثل والدہ	نعیم احمد بلوچ	27
8۔	لائبریری کی پائیدار اہمیت	صباحت واحدی/ وجیہہ حسان واحدی	34
9۔	جڑوں کی حفاظت	نعیم احمد بلوچ	43
10۔	بپسی سدھوا: لاہوری مصنفہ	علی عباس	50
11۔	خود مختاری: مرد و زن کا مشترکہ حق	علیزے نجف	55
12۔	بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ کی بازگشت	محمد وقاص رشید	60
13۔	اُلو برائے فروخت نہیں	ثوبیہ نورین	64
14۔	نامے جو میرے نام آئے !	وجیہہ حسان واحدی	68

استاد جاوید احمد غامدی

نکاح اور مہر کی حقیقت

وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿النساء 24﴾

ترجمہ

”اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں، الّا یہ کہ وہ تمھاری ملکیت میں آ جائیں۔ یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کی گئی ہے۔ اور اِن کے ماسوا جو عورتیں ہیں، (اُن کا مہر ادا کر کے) اپنے مال کے ذریعے سے اُنھیں حاصل کرنا تمھارے لیے حلال ہے، اِس شرط کے ساتھ کہ تم پاک دامن رہنے والے ہو نہ کہ بدکاری کرنے والے۔ پھر (اِس سے پہلے اگر مہر ادا نہیں کیا ہے تو) جو فائدہ اُن سے اٹھایا ہے، اُس کے صلے میں اُن کا مہر اُنھیں ادا کرو، ایک فرض کے طور پر۔ مہر ٹھیرانے کے بعد، البتہ آپس کی رضامندی سے جو کچھ طے کر لو تو اُس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بے شک، اللہ علیم و حکیم ہے۔“

تفسیر

اس تعلیم کا پہلا مخاطب وہ معاشرہ تھا جہاں جنگوں میں عورتوں کو قیدی بنایا جاتا تھا۔ اس زمانے کا دستور یہی تھا کہ کسی

کی ملکیت میں آتے ہی اُن عورتوں کا پہلا نکاح آپ سے آپ ختم سمجھا جاتا تھا۔ یہ اُس زمانے کا قانون تھا جسے قرآن نے بھی باقی رکھا۔ چنانچہ قیدی عورتیں اگر چاہتیں تو پکڑے جانے کے بعد کسی بھی شخص سے نکاح کر سکتی تھیں۔ اِس کے لیے اُنھیں اپنے پہلے شوہروں سے طلاق لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

مہر کی حقیقت:

اِس سے واضح ہے کہ نکاح مال، یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ چنانچہ آگے ہدایت فرمائی ہے کہ اِس سے پہلے اگر کسی عورت کا مہر ادا نہیں کیا گیا تو اُسے فوراً ادا کر دیا جائے۔ یہ مہر کیا ہے؟ مرد و عورت نکاح کے ذریعے سے مستقل رفاقت کا جو عہد باندھتے ہیں، اُس میں نان و نفقہ کی ذمہ داریاں ہمیشہ سے مرد اٹھاتا رہا ہے، یہ اُس کی علامت ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'صَدَقَۃ' اور 'اَجر' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ رقم جو عورت کی رفاقت کے صلے میں اُس کی ضرورتوں کے لیے دی جائے۔ نکاح اور خطبے کی طرح یہ بھی ایک قدیم سنت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب میں اِسی طرح رائج تھی۔ بائیبل میں بھی اِس کا ذکر اِسی حیثیت سے ہوا ہے۔ پیدایش ۱۲: ۳۴، خروج ۱۷: ۲۲۔ اِس کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

''۔۔۔ جس معاملے کے ساتھ ادائے مال کی شرط لگی ہو اور اُس ادائے مال کی حیثیت محض ایک نیکی اور احسان کی نہ ہو، بلکہ ایک فریضے کی ہو، یہاں تک کہ اگر اس کا ذکر نہ بھی ہو، جب بھی لازماً اسے موجود سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی (سٹیٹس) کے اعتبار سے اُس کی ادائیگی واجب قرار پائے، قانون اور دستور کے لحاظ سے ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے۔ کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا، جب تک وہ سو بار سوچ کر اُس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ـــــ اِن ضرورتوں سے مہر کی شرط ضروری ہوئی۔ جن لوگوں کی نظر اِن ضرورتوں کی طرف نہیں گئی، وہ سمجھتے ہیں کہ اِس شرط نے عورت کو ایک قابل خرید و فروخت شے کے درجے تک گرا دیا ہے۔ اس لیے مہر کو عورت کی قیمت خیال کرنا محض نا سمجھی کا نتیجہ ہے۔ یہ شرط تو ایک علامت ہے کہ جو بھی عورت کے حرم میں قدم رکھنا چاہے، وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم رکھے۔ نکاح و طلاق کے معاملے میں کسی مذاق کی گنجایش نہیں ہے۔ یہاں مذاق بھی حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/۲۷۸)

فریقین کی پاک دامنی:

اِس سے واضح ہے کہ نکاح کے لیے پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ کوئی زانی یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی پاک دامن سے بیاہ کرے اور نہ کوئی زانیہ یہ حق رکھتی ہے کہ کسی پاک دامن مرد کے نکاح میں آئے، الاّ یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ واستغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اِس گناہ سے پاک کر لیں۔

مہر کی مزید وضاحت:

یہ ایک مخصوص رقم یا کوئی شے ہوتی ہے جو شوہر کو شادی کے وقت اپنی بیوی کو ادا کرنا ہوتی ہے یا وہ اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اسے بعد میں ادا کر دے گا۔ کچھ لوگوں نے بالکل غلط سمجھا ہے کہ مہر بیوی کو اپنانے کی رقم ہے جو شوہر کو ادا کرنی ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہر اس ذمہ داری کا ایک علامتی اظہار ہے جو اسلام شوہر کے کندھوں پر ڈالتا ہے کہ وہ بیوی اور بچوں کی کفالت کرے گا۔ یہ اسی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خاندان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کمائے۔ مہر اس ذمہ داری کا صرف ایک ٹوکن ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب ایک آدمی اس رقم کو ادا کرتا ہے تو وہ اس حقیقت کا معنوی اظہار کرتا ہے کہ وہ اس خاتون کی معاشی ذمہ داریاں اٹھائے گا جسے وہ بیوی بنا رہا ہے۔ لہٰذا اس معاہدے کی روح یہ ہے کہ وہ دلہن کو گھر لے جانے سے پہلے مقررہ مہر ادا کر دے۔

یہاں اس بات کو واضح کرنا بے محل نہ ہوگا کہ مہر کی رقم، جیسا کہ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ معاشرے کے رواج اور دستور کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کی جائے گی: وَاٰتُوْہُنَّ اُجُوْرَہُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۴:۲۵)

”اور انھیں دستور کے مطابق ان کے مہر ادا کرو۔“

چنانچہ اسلام نے مہر کی کوئی خاص رقم مقرر نہیں کی اور اسے معاشرے کے رواج و دستور پر چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے مہر ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مہر کی رقم مقرر کرتے وقت شوہر کی آمدنی اور بیوی کی معاشرتی حیثیت کو سامنے رکھا جانا چاہیے۔

(تسہیل: نعیم بلوچ)

استاد جاوید احمد غامدی

عورتوں کا محرم کے بغیر سفر

لَا یَحِلُّ لِاِمْرَأَۃٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ تُسَافِرُ مَسِیْرَۃَ یَوْمٍ وَلَیْلَۃٍ إِلاَّ مَعَ ذِیْ مَحْرَمٍ عَلَیْھَا۔ (مسلم، رقم ۱۳۳۹)

ترجمہ

”کسی ایسی خاتون کے لیے جائز نہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہو کہ وہ اپنے کسی محرم کے بغیر ایک دن اور ایک رات کے سفر کے برابر اکیلے سفر کرے۔“

مفہوم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو شوہر یا محرم یعنی باپ، سسر، ماموں، بھائی وغیرہ، جن سے نکاح حرام ہے کے بغیر سفر کرنے سے روکا اور فرمایا ہے کہ اِس طرح کا سفر اُن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس کی مدت بعض روایتوں میں ایک، بعض میں دو اور بعض میں تین شب و روز بیان ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر علماء کا بھی یہی موقف ہے۔ جامعیہ علوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی کے فتوے کے مطابق:

اگر عورت کا اپنے شہر یا علاقہ سے باہر سفر کا ارادہ ہو اور اڑتالیس میل (سوا ستتر کلومیٹر) یا اس سے زیادہ مسافت کا سفر ہو تو جب تک مردوں میں سے اپنا کوئی محرم یا شوہر ساتھ نہ ہو اس وقت تک عورت کے لیے شرعاً سفر کرنا جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت آئی ہے۔ البتہ سفر شرعی سے کم مسافت کے سفر میں اگر

فتنہ کا خوف نہ ہو تو اکیلے سفر کی گنجائش ہے۔ عمومی احوال میں بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اڑتالیس میل سے کم یا شہر کے اندر بھی بالکل تنہا سفر نہ کرے۔

جاوید احمد غامدی حدیث کا مفہوم واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ "سدِّ ذریعہ" کی ہدایت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ اصل میں منع نہیں ہے، لیکن ممنوعات میں سے کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اِس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں۔ اِس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی۔

(یاد رہے کہ سعودی عرب نے حج و عمرہ کے لیے اسی حکم کی بنا پر خواتین کے لیے سفر کے لیے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ محرم ہی کے ساتھ حج و عمرے کا سفر کر سکتی ہیں۔ حال ہی میں سعودی حکومت نے یہی شرط ختم کر دی ہے۔)

پھر یہ بات بھی واضح رہے کہ اِس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اُس کے پیش نظر ضروری تھا کہ زمانۂ رسالت کے حالات میں اُنھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے۔ اُس زمانے میں سفر پیدل یا اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ جن مقامات تک اب ہم گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں، اُس وقت وہاں پہنچنے میں ہفتے، بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے۔ رات آ جاتی تو کھلے آسمان تلے قافلوں میں یا اجنبی شہروں کی سرایوں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اِس طرح کے حالات میں اگر عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور اُنھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر سفر نہ کریں تو اِس کی حکمت ہر سلیم الطبع (عام سمجھ بوجھ رکھنے والا) آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

دور حاضر نے اِس کے برخلاف سفر کے ذرائع میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مہینوں کا سفر اب گھنٹوں میں ہوتا ہے۔ ریل، جہاز اور بسوں میں حفاظت کے غیر معمولی انتظامات ہیں۔ ہوٹلوں اور سرایوں وغیرہ کا نظم بھی بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی خدشہ ہوتا تھا، لیکن اب یورپ اور امریکا کے سفر میں بھی اِس طرح کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں اپنی شناسا عورتوں کے ساتھ نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جا سکتی اور حج و عمرہ کے مناسک ادا کر سکتی ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دور حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے اور عورتوں کو اجازت دی جائے کہ خطرے کی کوئی جگہ نہ ہو تو اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ

تعلیم الحدیث

تنہا یا عورتوں کی معیت میں جس طرح چاہیں، سفر کریں، تاہم اتنی بات ملحوظ رکھیں کہ اُن کی عزت ہر حال میں محفوظ رہے اور گھروں سے نکلتے وقت اُن سے کوئی غفلت نہ ہو۔ وہ اگر اللہ اور اُس کے رسول کو ماننے والی ہیں تو اِس معاملے میں اُنھیں بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔

مدیر کے قلم سے

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ!

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا مشہور شعر ہے

غَلَطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے بارے میں بہت غلط فہمیاں ہیں کہ وہ ہمارے رونے دھونے سے متاثر ہو جائے گا۔ مگر شعر پر کئی اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ غالب نے پہلی بار کسی شعر میں لفظ ''غَلَطی'' استعمال کیا۔ اس سے قبل ایسی غلطی کسی نے نہیں کی تھی۔ ''غلطی'' کے لیے بھی لفظ ''غلط'' ہی استعمال ہوتا تھا۔ میرؔ کا یہ شعر اس کی مثال ہے۔

غلط اپنا کہ اُس جفا جُو کو
سادگی سے ہم آشنا سمجھے

میرؔ شریف آدمی تھے، اپنی ہی ''غلطی'' کا اعتراف کیا ہے، غالبِ بے مثل کی ادا دیکھیے، لوگوں پر بات ڈال دی ۔ میر نے اسے ''غلطی'' نہیں کہا ''اپنا غلط'' قرار دیا۔ یوں غالبؔ کی غلطی سے اردو میں ''غلطی'' عام ہو گئی۔ مشہور مقولہ ہے "غَلَطُ العام فصیحٌ"۔ یعنی جو غلطی عام ہو جائے اور جسے فصحاء جائز قرار دیں وہ فصیح ہو گیا۔ اسی طرح نالے کی پہنچ یعنی رسائی کو "رسا باندھنا" بھی غالب ہی کا کمال تھا۔ اہل زبان تھے اس لیے ان کا فرمایا ہوا مستند ٹھہرا۔

کچھ یہی حال فیمنزم کا ہے۔اس کی غلطیوں کا بھی مت پوچھیے۔اس تحریک میں خرابی تو کوئی نہ تھی،سیدھی سادی حقوقِ نسواں کی آواز تھی۔خواتین کے ووٹ دینے کے مطالبے سے شروع ہوئی اور بڑھتے بڑھتے "ازم" بن گئی۔ مسلمانوں کے معاشرے میں آئی تو اپنے پورے "لوازم" کر ساتھ آئی۔اب لوگوں کا کیا ہے،وہ لفظ "لوازم" کو "لوّ ۔ازم" بھی پڑھ سکتے ہیں۔حقوق نسواں کی اس تحریک کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔اسلام میں خواتین کے ساتھ " انصاف" کرنے کا حکم ہے مگر فیمنزم میں یہ مساوات اور برابری بن گیا۔حالانکہ اللہ عادل ہے چنانچہ اس نے انصاف سے کام لیا اور عورت کے حالات کا لحاظ رکھا۔اسے ایامِ خاص میں نمازوں اور روزے وغیرہ سے رخصت دی۔بات مساوات کی ہوتی تو کوئی رخصت نہ ہوتی،مگر پروردگار نے عدل کیا اور ان پر بوجھ نہ ڈالا۔برابری کی بات ہوتی تو ماں اور باپ کے حقوق برابر ہوتے لیکن سب جانتے ہیں ماں کے حقوق باپ کی نسبت تین گنا ہیں۔مزید یہ کہ زمانے کے چلن کا لحاظ کیا اور خاندان کی معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ شوہر پر ڈالا،مگر غلطی یہ ہوئی کہ یہاں "شوہر" کے بجائے "مرد" سمجھنے کی غلطی کی گئی۔یہاں بھی دیکھ لیجیے بھائی بہن پر قوام نہیں،بیٹا،بیٹی پر قوام نہیں وغیرہ۔ماں چاہے نحیف و ناتواں ہو،چھ فٹ کے مرد کو تھپڑ مار سکتی ہے اور وہ ہاتھ اٹھائے تو راندا ہ درگاہ ہو جاتا ہے۔بڑی بہن چھوٹے بھائی کے کان کھینچے یا گوشمالی کر ڈالے،وہ احترام سے سر جھکا دیتا ہے۔

آزادی اور خود مختاری کا مطلب حدود نا آشنا لیا جاتا ہے حالانکہ اس کا مطلب نشوز نہیں،بغاوت نہیں بلکہ خود انحصاری ہے۔یعنی عورت کو ناموافق حالات میں کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے یا عام حالات میں بھی وہ شوہر ہی کی محتاج ہو کر نہ رہ جائے بلکہ وہ اپنے ذوق اور ضروریات کو "آزادی" اور "فراخی" سے پورا کر سکے۔اسی طرح عورت جب بیوی بنتی ہے تو برصغیر میں روایت ہے کہ اس کے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگا دیا جاتا ہے۔جب کہ عربی معاشرہ ہو یا مغربی،وہاں طلاق و علیحدگی کی شرح بہت ہے۔اب عورت تو اپنے شناختی کارڈ کی تصحیح کراتی پھرے گی۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت ہو یا مرد،اس کی قابلِ قبول شناخت،اس کے قانونی باپ یا ماں سے منسوب ہونے سے ہے۔ماں یا باپ یا شوہر پر اصرار اضافی ہے۔

پردے پر اعتراض کو بھی فیمنزم کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔لیکن اصلاً یہ قرآن کے ناقص فہم کی وجہ سے ہے۔ علمی بحث سے قطع نظر،یہ خدا کا حکم ہو ہی نہیں سکتا۔عقلاً ہی محال ہے۔پردہ خدا کی صفت "عدل" کے خلاف ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ عورت کو دیکھ کر مرد کو جنسی تحریک ہوتی ہے۔اگر یہ درست ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر قابو پانا سیکھے،اپنی نگاہوں کے آگے کوئی ایسا فلٹر لگائے کہ اسے عورت کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہ دے۔یہ

قصہ مختصر

کہاں کا انصاف ہے کہ وہ اپنی "کھجلی" کو قابو میں رکھنے کے لیے عورت کو اپنا چہرہ کپڑے کی دیوار کے پیچھے دھکیل دینے پر مجبور کرے۔ اسی لیے قرآن چہرے کو جنسیاعضاء میں شامل نہیں کرتا۔ وہ یہ آداب سکھاتا ہے کہ نگاہوں کو مہذب اور پست رکھا جائے۔ اس کا فیمنزم سے کوئی تعلق نہیں۔

کوکب شہزاد

عدت اور اس کے مسائل

عدت کا مطلب ہے: گننا۔ قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال دو قسم کی خواتین کے لیے ہوا ہے۔ ایک طلاق یافتہ کے لیے اور دوسرا بیوہ کے لیے۔ طلاق یافتہ خاتون کی عدت تین حیض بتائی گئی ہے اور بیوہ کی عدت چار مہینے اور دس دن مقرر کیے گئے ہیں، یعنی طلاق یافتہ خاتون تین حیض مکمل ہونے تک شادی نہیں کر سکتی اور بیوہ چار مہینے دس دن تک شادی نہیں کر سکتی۔

عدت کا صرف اور صرف مطلب یہ ہوتا ہے کہ مطلقہ اور بیوہ کا اگر حمل ہے تو وہ واضح ہو جائے اور اگر ان خواتین کے پیٹ میں بچہ ہے تو اس کی نسبت واضح طریقے سے معلوم ہو جائے۔

بیوہ کی عدت مطلقہ سے زیادہ اس لیے ہے کہ طلاق دینے کا طریقہ اسلام نے یہ بتایا ہے کہ خاتون جسے طلاق دینا مقصود ہو، اسے حیض کے گزرنے کے بعد پاکیزگی کے ان ایام میں طلاق دی جائے جن میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہوا ہو۔ جب کہ یہ واضح ہوتا ہے کہ ان عدت کے ایام میں حمل نہیں ہو سکتا، جبکہ بیوہ کے شوہر کا انتقال ہوتا ہے اور ان میں دنوں کی گنتی متعین نہیں ہوتی۔ چنانچہ حمل واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مدت کو بڑھا دیا ہے۔

ایک وہ دور تھا

سورۂ بقرہ میں آیت ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ. (۲:۲۲۸)

”اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔“

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو شادی کرنے سے تین حیض تک روکے رکھیں تاکہ مطلقہ کے بارے میں پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ چاہے خاتون آئسہ مدخولہ (وہ شادی شدہ عورت جسے زیادہ عمر کی وجہ سے حیض نہ آتے ہوں) ہو یا ایسی خاتون ہو جسے بیماری کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو۔ ہر طرح کی صورت حال میں اس عرصے میں حمل ہونے یا نہ ہونے کا امکان پوری طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ اور اگر حمل واضح ہو جائے تو پھر مطلقہ کی عدت وضع حمل ہو گی، یعنی بچے کی پیدایش تک عدت ہو گی، چاہے بچہ ایک مہینے کے بعد پیدا ہو یا طلاق ملنے کے نو مہینے کے بعد پیدا ہو۔ اصل مقصد وضع حمل ہے۔ بچے کی پیدایش کے بعد خاتون اپنے بارے میں فیصلہ لینے کے لیے آزاد ہے۔

لیکن اگر نکاح ہو گیا ہو اور میاں بیوی کا تعلق پیدا نہ ہوا ہو تو طلاق کی صورت میں کوئی عدت نہیں ہو گی، کیونکہ مطلقہ کے حمل کا کوئی امکان نہیں ہو گا، جس کے لیے عدت کی جائے۔

عدت کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے چند احکامات دیے ہیں، جن کا خیال میاں بیوی، دونوں کو رکھنا چاہیے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق میں بیان کیا ہے:

1۔ مطلقہ کو عدت کے دوران میں اپنے شوہر کے گھر میں رہنا چاہیے اور شوہر کو بھی اپنی مطلقہ کو اپنے گھر میں رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، شاید ان کے ایک دوسرے کے قریب رہنے سے اللہ تعالیٰ ان کے درمیان صلح کے امکانات پیدا کر دیں اور وہ پھر سے اکٹھے ہو جائیں۔ ایک ٹوٹتا ہوا گھر بچ جائے اور ان کے بچے در بدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچ جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کے الٹ ہوتا ہے۔ جس خاتون کو طلاق ملتی ہے، وہ اب شوہر کے گھر میں ٹھیرنا اپنی خودداری اور انا کے منافی سمجھتی ہے اور اس کے گھر والے بھی اپنی بچی کو وہاں چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ اور شوہر تو پہلے ہی الزامات کا پلندہ اپنی مطلقہ پر لگا چکا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے دونوں خیر و برکت سے محروم ہو چکے ہوتے ہیں۔

2۔ شوہر کی ذمہ داری ہے کہ اگر اس کی بیوی اس کے گھر رہ کر عدت گزارنا چاہتی ہے تو وہ اس کی رہایش اور نان و نفقے کا اپنی حیثیت کے مطابق انتظام کرے اور اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دے۔

3۔ مطلقہ کی سب سے اہم ذمہ داری ہے کہ ان تین مہینوں کے دوران میں اس پر اپنا حمل واضح ہو گیا ہے تو محض جان چھڑانے کے لیے اسے اپنے شوہر، یعنی بچے کے باپ اور سسرال والوں سے نہ چھپائے اور پوری صورت حال ان پر واضح کرے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ.

(۲: ۲۲۸)

''اور (یہ دوسری صورت پیدا ہو جائے تو) جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار کرائیں۔ اور اگر وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لیے جائز نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹ میں پیدا کیا ہے، اُسے چھپائیں۔ اور اُن کے شوہر اگر معاملات کی اصلاح چاہیں تو اِس (عدت کے) دوران میں زیادہ حق دار ہیں کہ اُنھیں لوٹا لیں اور (یہ اِس لیے ہے کہ اِس میں تو شبہ نہیں کہ) اِن عورتوں کے لیے بھی اُسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق اُن پر (شوہروں کے) حقوق ہیں، لیکن مردوں کے لیے (شوہر کی حیثیت سے) اُن پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ (یہ اللہ کا حکم ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔''

عدت گزارنے کے بعد خاتون آزاد ہے، وہ جہاں چاہے اپنی شادی کرے۔ سابقہ شوہر کو اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

بیوہ کی عدت اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں

جس خاتون کا میاں فوت ہو جائے، اسے بیوہ کہتے ہیں اور اس کی عدت اللہ تعالیٰ نے چار مہینے اور دس دن مقرر کی ہے۔ بعض اوقات لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیوہ کے شوہر کے مرنے کی وجہ سے عدت میں سوگ بہت زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس کی مدت چار مہینے دس دن مقرر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں سوگ منانے کا عنصر نہیں، بلکہ طلاق کی عدت کم ہونے اور بیوہ کی عدت زیادہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا یہ طریقہ بتایا کہ طلاق حیض ختم ہونے کے بعد پاکیزگی کے ان ایام میں دی جائے جن میں میاں بیوی کا تعلق قائم نہ ہوا ہو۔ اور اس کے بعد خاتون تین حیض تک شادی نہیں کرے گی۔ اور ان تین حیض کے عرصے میں اگر شوہر اسے نہیں روکتا تو وہ آزاد ہے۔ وہ جس سے چاہے، شادی کر سکتی ہے، جب کہ بیوہ کے مرنے کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کرنا ممکن نہیں، اس لیے اس کی عدت کے دنوں کو بڑھا کر چار مہینے دس دن کر دیا گیا۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوہ اگرچہ افسردہ ہوتی ہے، لیکن عدت کا افسردگی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب بھی حمل کا واضح ہونا ہے تاکہ بچے کی نسبت

اپنے حقیقی والد سے ہو سکے۔ بچے کے خاندان، نسل اور وراثت کا صحیح تعین ہو سکے۔ اور چار مہینے دس دن تک وہ شادی نہیں کرے گی۔ عدت گزرنے کے بعد وہ آزاد ہے۔ وہ جہاں چاہے، شادی کرے اور شوہر کا خاندان اور اس کے میکے والے اس کی شادی کی مخالفت نہ کریں۔

بیوہ کی عدت کے دوران میں اس پر نام نہاد پابندیاں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ. وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۤءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًاقمح وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ. (البقرہ ۲: ۲۳۴ ۲۳۵)

”اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اور تمھارے لیے اِس میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام اُن عورتوں کو دو یا اُس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے یہ بات تو کرو گے ہی۔ سو کرو، لیکن (اِس میں) کوئی وعدہ اُن سے چھپ کر نہ کرنا۔ ہاں، دستور کے مطابق کوئی بات، البتہ کہہ سکتے ہو۔ اور نکاح کی گرہ اُس وقت تک نہ باندھو، جب تک قانون اپنی مدت پوری نہ کر لے۔ اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اِس لیے اُس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔“

ہمارے معاشرے میں بیوہ کی زندگی کو اجیرن کر دیا جاتا ہے۔

1۔ بیوہ کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عدت کے دوران میں گھر سے باہر قدم رکھے گی تو اس کے شوہر کو عذاب دیا جائے گا۔ یہ بالکل جاہلانہ بات ہے یہ بات وہی لوگ ہی کہہ سکتے ہیں جو قرآن مجید کی باتوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔

2۔ بیوہ کو بڑی سخت پابندیوں میں رہتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اگر وہ عدت کے دوران میں کسی بھی کام کے لیے گھر سے نکلی تو جب وہ اپنے شوہر کی قبر پر اس کے لیے دعا کرنے جائے گی تو اسے اپنے شوہر کی قبر دکھائی نہیں دے گی، جو کہ سراسر غلط بات ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل تو وفات کے بعد خاتون اگر ملازمت کرتی ہے تو اسے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی ملازمت پر جانا انتہائی ضروری ہے اور بھی کئی formalities کو پورا کرنے لیے گھر سے نکلنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ہاں، ایک بات ضرور ہے کہ وہ حمل کے واضح ہونے سے پہلے کسی ایسی جگہ پر اکیلی نہ جائے جہاں اس کے بچے کی نسبت پر الزام لگایا جا سکے۔

ہمارے ایک بہت ہی قریبی عزیز وفات پا گئے تو ان کی بیوہ نہ صرف یہ کہ کسی کے سامنے نہیں آتی تھیں، بلکہ اگر بیرون ملک سے ان کے کسی عزیز کا تعزیت کرنے کے لیے فون آتا تو وہ اس سے فون پر بھی بات نہیں کرتی تھیں تا کہ کوئی غیر محرم ان کی آواز نہ سن لے۔ یہ بالکل غیر ضروری پابندیاں ہیں اور ان کا ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اللہ اپنے لوگوں کے لیے آسانیاں چاہتا ہے، مشکلات نہیں۔ ہمارے ہاں عدت کی غیر ضروری پابندیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بزرگ کافی عرصہ ہندوؤں کے ساتھ رہے۔ اور ان کے ہاں بیوہ کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بیوہ کو منحوس سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کسی لڑکی کی شادی کے موقع پر اگر کوئی بیوہ اس کو پیار کرنے لگتی ہے یا اس کے ہاتھوں پر منہدی لگانے کے لیے آگے بڑھنے لگتی ہے تو اس کو روک دیا جاتا ہے۔

شوہر کی وفات کے فوراً بعد اس کی چوڑیوں کو جو اس نے پہنی ہوتی ہیں، فریضۂ منصبی سمجھتے ہوئے توڑ دیا جاتا تھا۔ اس بے چاری پر پہلے ہی آفت ٹوٹ پڑی ہوتی ہے مزید لوگوں کی زیادتیاں اسے ہوش و حواس میں نہیں رہنے دیتیں۔

ہندوستان میں بیوہ تا عمر سفید ساڑھی پہننے پر مجبور ہوتی ہے اور ظلم کی انتہا یہ کہ کافی صدیوں تک بیوہ کے سر کے بال مونڈھ دیے جاتے تھے تا کہ وہ کسی کے دل کو نہ بھائے۔ اسے کھانے پینے کو اتنا کم اور سادہ دیا جاتا اور زمین پر الگ تھلگ کمرے میں چارپائی پر سلایا جاتا اور بہت عرصے تک، بلکہ بھارت کے بعض علاقوں میں اب بھی اسے شوہر کی چتا میں دلہن بنا کر ستی کر دیا جاتا ہے۔ یہ تو انگریزوں کی مہربانی ہے کہ انھوں بہت ساری بے ہودہ رسموں کو بھارت میں ختم کیا، لیکن ہم ابھی بھی ان کی بعض رسموں کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم میں سے بہت سارے

مسلمانوں کو پتا نہیں کہ عدت کا مقصد کیا ہے، اندھا دھند ہم دوسروں کی نقل میں بگ ٹٹ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی بیوہ خاتون اپنے سسرال میں عدت گزار رہی ہے تو اسے سسرال کے ماحول میں بننے سنورنے سے احتراز کرنا چاہیے، لیکن اس بات کا تعلق سسرال والوں کے جذبات کا احترام کرنا ہے۔ یہ بات عدت کے شرائط میں سے نہیں۔ عدت کا اصل مقصد، جیسا کہ ہم بار بار کہہ رہے ہیں، حمل کا واضح ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (۲:۲۴۰) میں بیوہ کے حق میں بہت زبردست احکام دیے ہیں۔ اس بات کی وصیت ہر شوہر کو اپنی بیوی کے بارے میں دینی چاہیے۔ یہ وصیت اس میراث کے علاوہ ہے جو بیوی کو شوہر کی طرف سے ملتی ہے۔ ہمارا دین کتنا متوازن اور خوب صورت دین ہے۔ اس نے تو یہاں بیوہ کے حق میں کہا ہے کہ اگر بیوہ کی عدت کے دوران میں کوئی اسے شادی کا پیغام دینا چاہے تو اشارے کنایے میں پیغام دے سکتا ہے، لیکن ان کا نکاح تو عدت گزرنے کے بعد ہی ہوگا۔

کیا دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے جس کے ایک ایک حکم میں گہرا فلسفہ اور گہری منطق پائی جاتی ہو۔

اور اسی حکمت کے تحت اس نے مطلقہ اور بیوہ کی عدت مقرر کی ہے تاکہ حمل واضح ہو سکے، اس کے علاوہ عدت کی کوئی اور وجہ نہیں۔

محمد حسن الیاس

ہمارے بزرگوں کا تصور عورت

عورت کے حوالے سے منفی تصورات انسانی تاریخ کی قدیم تہذیبوں سے چلے آرہے ہیں۔ قدیم فلسفیوں، جیسے کہ افلاطون اور ارسطو، سے لے کر موجودہ دور کی مذہبی روایت تک، ہر عہد کے مفکرین نے اپنے اپنے دائرۂ فکر میں عورت کی حیثیت اور اس کی فطرت پر غور وخوض کیا ہے۔ ان فلسفیانہ تصورات کی بنیاد، زیادہ تر تخیلاتی اور قیاسی دلائل پر استوار تھی۔ ان مفروضات کو وقت کے ساتھ چیلنج کیا گیا اور بالآخر مسترد کر دیا گیا، کیونکہ ان میں کوئی مضبوط اور علمی بنیاد موجود نہیں تھی۔

تاہم، جب ہم مذہبی بیانیے کا جائزہ لیتے ہیں تو معاملہ کچھ مختلف اور زیادہ حساس نظر آتا ہے۔ مذہب کے دائرے میں علما اپنی رائے کے حق میں قرآنی آیات اور احادیث کا حوالہ پیش کرتے ہیں، جو نہ صرف ان کے بیانیے کو قوت بخشتا ہے بلکہ ان کے فہم کو تقدس بھی عطا کرتا ہے۔ اس تقدس کی بنیاد پر، وہ اپنی آرا کو حرفِ آخر اور الہامی نوعیت کا حامل تصور کرتے ہیں، اور جو ان کی رائے سے اختلاف کرے، اسے قرآنی اور دینی تعلیمات سے انکار کرنے والے کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مذہبی بیانیے کے باب میں کسی اختلافِ رائے یا تنقید کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس رویے کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب کے نام پر پیش کیے جانے والے بعض نظریات، جو شاید اصل دینی تعلیمات کی عکاسی نہ کرتے ہوں، بھی لوگوں میں قبولیت پاتے ہیں، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی رد عمل کی نفسیات جنم لیتی ہے جو لوگوں کو دین کی اصل اور پاکیزہ ہدایت سے دور کر دیتی

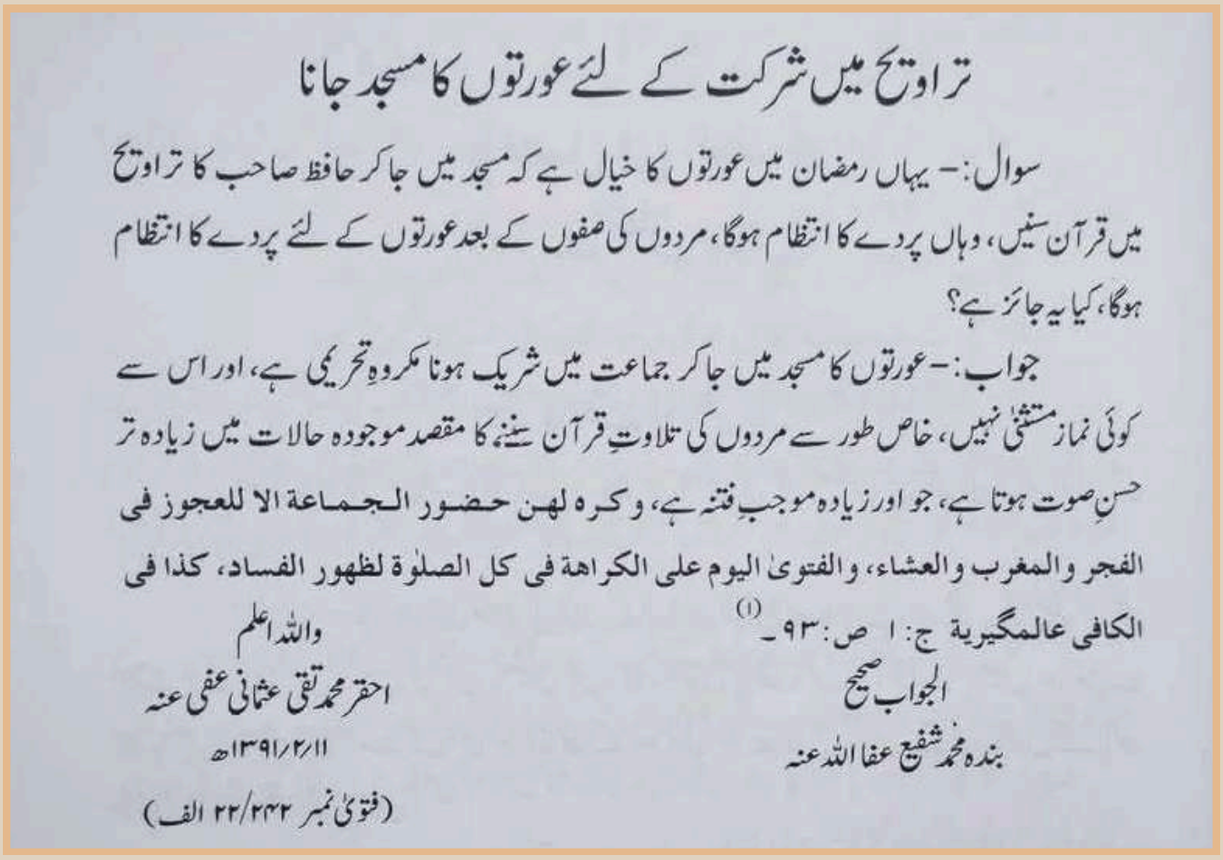

تراویح میں شرکت کے لئے عورتوں کا مسجد جانا

سوال:- یہاں رمضان میں عورتوں کا خیال ہے کہ مسجد میں جاکر حافظ صاحب کا تراویح میں قرآن سنیں، وہاں پردے کا انتظام ہوگا، مردوں کی صفوں کے بعد عورتوں کے لئے پردے کا انتظام ہوگا، کیا یہ جائز ہے؟

جواب:- عورتوں کا مسجد میں جاکر جماعت میں شریک ہونا مکروہِ تحریمی ہے، اور اس سے کوئی نماز مستثنیٰ نہیں، خاص طور سے مردوں کی تلاوتِ قرآن سننے کا مقصد موجودہ حالات میں زیادہ تر حسنِ صوت ہوتا ہے، جو اور زیادہ موجبِ فتنہ ہے، وکرہ لهن حضور الجماعة الا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتویٰ الیوم علی الکراهة فی کل الصلوٰة لظهور الفساد، کذا فی الکافی عالمگیریة ج: ۱ ص: ۹۳۔[1]

الجواب صحیح
بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم
احقر محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۳۹۱/۲/۱۱ھ

(فتویٰ نمبر ۲۲/۲۴۲ الف)

ہے، اور موجودہ دور میں یہی وجہ دین بیزاری کی روایت کو فروغ دے رہی ہے۔

یہ اثرات کیسے ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال یوں سمجھیں: ایک فتوے میں سوال کیا گیا کہ کیا عورت مسجد میں نماز ادا کر سکتی ہے؟ جواب آیا: "بالکل نہیں۔" اس جواب کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ اگر عورت مسجد میں آئے گی تو قرآن کی تلاوت سننے کا امکان ہوگا، اور چونکہ تلاوت ایک خوش الحان اور دلکش انداز میں کی جاتی ہے، اس بات کا خدشہ ہے کہ عورت اس آواز کے سحر میں مبتلا ہو کر کسی فتنے کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس بنیاد پر عورت کو مسجد آنے سے روکا گیا۔

یہ مثال ہمارے علما کے تصورِ عورت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس تصور میں عورت کو ایک ایسی کمزور اور جذباتی مخلوق کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کسی بھی لمحے اپنی فطری کمزوریوں کے باعث امتحان میں مبتلا ہو سکتی ہے۔ اس نقطہ نظر میں عورت کی شخصیت، اس کے کردار، اور اس کی اخلاقی قوت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اسے ایک ایسی مخلوق کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ہر لمحہ جنسی ابتلا کا باعث بن سکتی ہے۔

اس کے برخلاف، جب ہم رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور عمل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک مختلف تصور ملتا

تصور عورت

ہے۔ آپ ﷺ نے عورتوں کو مسجد میں آنے، نماز پڑھنے اور عبادات میں شریک ہونے کا ویسا ہی حق دیا جیسا کہ مردوں کو حاصل ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں خدا کے گھر آنے اور اجتماعی عبادت میں شریک ہونے کی اجازت دی، کیونکہ عورت بھی مرد کی طرح خدا کی مخلوق ہے اور اس کا بھی خدا سے تعلق قائم کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مرد کو حاصل ہے۔ کچھ عملی مسائل، جیسے کہ شوہروں کے لیے بیویوں کا مسجد جانا کسی دشواری کا باعث بن رہا ہو، تو ایسی صورت میں آپ ﷺ نے انہیں ترغیب دی کہ وہ گھر پر نماز ادا کریں، مگر کبھی بھی انہیں مسجد آنے سے کلی طور پر منع نہیں کیا۔

یہ رسالت مآب ﷺ کا اسوہ تھا، لیکن آج کے بعض علما عورت کے قرآن سننے کو بھی فتنے کا باعث سمجھتے ہیں، جو ایک نہایت محدود اور قدامت پرستانہ نقطہ نظر ہے۔ اس کا تعلق فلسفے یا کلچر سے تو ہو سکتا ہے، مگر دین اسلام سے نہیں۔ جب ایک عورت یہ سنے گی کہ دین کے نزدیک اس کی حیثیت کس قدر کمزور اور ناپائیدار ہے، تو کیا وہ دل سے خدا کے قریب آنے کی کوشش کرے گی؟

لہذا، مسئلہ عورت کے خدا کے گھر آنے پر نہیں، بلکہ اسے برابر کا انسان سمجھنے پر ہے۔

ثوبیہ نورین

بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو

دنیا کے سب سے اہم موضوع پر اہم ترین تجاویز جو آپ کی سوچ بدل سکتے ہیں۔

ایلفی کوہن نے تربیت اولاد کا تعارف بیان کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

"بچے پروان چڑھانا بزدل اور احمق لوگوں کا کام نہیں۔"

تعلیم، نفسیات اور انسانی رویوں کے معروف لیکچرار اور مصنف کے یہ الفاظ شعور رکھنے والے انسان کی نیندیں اور ہوش اڑا دینے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن افسوس اگلی نسل کو پروان چڑھانے اور انسانیت کا مستقبل جن افراد اور اذہان پر مبنی ہے، ان کو سنوارنے، خود اچھے والدین بننے کے لئے ہمارے ہاں اتنی تربیت لینے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی جتنی کھانا پکانے، لکڑی کی چیزیں بنانے، صفائی ستھرائی کرنے یا پلمبنگ، فری لانسنگ یا ڈیجیٹل مارکٹنگ سیکھنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

آپ لوگ سچ سچ بتائیں کہ کیا ایسا ہوتا ہے یا ہونا چاہیے کہ ایک ٹیچر، درزی، بیوٹیشن، ڈاکٹر، انجینئر بننے کے لئے ڈگری اور مہارت دونوں دیکھے بغیر جاب دے دی جائے؟

یہ دونوں قابلیتیں ہوں تو جا کر لوگ قانونی طور پر اپنی شناخت یا کمپنی رجسٹر کر پاتے ہیں: یا پریکٹس شروع کر سکتے ہیں، لیکن شادی کرنے اور بچے پالنے کے لئے، یعنی ایک الگ منفرد انسانی جان کو پروان چڑھانے کے لیے کسی قسم کی کوئی تربیت یا افراد کی ذہنی صحت کا معیار نہیں دیکھا جاتا۔ کیوں؟

تربیت اولاد

کیا آپ کو معلوم ہے کہ کئی ترقی یافتہ ممالک میں شادی کرنے اور اولاد پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ قوانین و ضوابط موجود ہیں! لیکن ہماری ذہنی پس ماندگی کا یہ حال ہے کہ بڑی خوشی سے یہ جملے بولے جاتے ہیں:

"چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔ بچوں کا شادی بیاہ کی باتوں سے کیا لینا دینا۔ بچے تو اللہ کی دین ہیں جتنے بھی ہوں"۔

ہماری اکثریت اس سلسلے میں بنیادی آگاہی کو ابھی تک جرم سمجھتی ہے۔ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ بچے پیدا کرنا اور ان کی افزائش کرنا تو انسانی فطرت ہے۔ کیا آپ قارئین و سامعین میں سے بھی کچھ کا یہ خیال ہے؟

ہر طرح کے فن اور مہارتیں بھی انسان ازل سے ہی سیکھتا اور کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن جوں جوں انسانی تہذیب نے ترقی کی انہوں نے ادارے تشکیل دیے۔ تاکہ ان فطری مہارتوں کو نکھارا جائے، بہترین تہذیب و تمدن تشکیل دینے کے لئے ان انسانی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے۔ پھر ہمارے ہاں، تربیت اولاد سے آخر اس قدر بے پروائی اور عدم حساسیت کا شکار کیوں ہے؟ حالانکہ ہزاروں بدترین اور گھمبیر نوعیت کے مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ والدین پریشان ہونے کے باوجود کبھی اپنی بدنامی کے ڈر سے کسی سے ذکر نہیں کرتے، تو کہیں یہ سوچ اذہان میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی ہے کہ پیدا کر دیا، دن بھر محنت کر کے کما کے کھلا رہے ہیں، پال پوس رہے ہیں اور بھلا کیا کریں؟ آج کل کے بچے ہے ہی بگڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑی سختی کر کے ٹھیک کر لیں گے۔ کچھ اس سوچ کے مالک ہیں کہ لاڈ پیار سے ہر مسئلہ حل ہو جائے گا۔

میں آج کل کے والدین کے مسائل اور جملے، جو ہر وقت ان کے حواس پر طاری رہتے ہیں، فرضی ناموں کے ساتھ مختصر مکالمے تحریر کر رہی ہوں۔ تاکہ اگر آپ بھی بچوں سے متعلق، ان مسائل اور الجھنوں کا شکار ہیں تو ہمیں لکھئے، آگاہ کیجئے تاکہ ہم تربیت اولاد کے حوالے سے بہترین اور موثر کاوش کو ممکن بنا سکیں۔

ہر مسئلے کو جڑ سے سمجھنے کے لئے میں نے والدین کے لئے سوالات تحریر کر دیے ہیں تاکہ وہ خود اپنے بارے میں سوچنے کے قابل ہو سکیں کہ آیا مسائل کس سوچ اور ذہنی شاکلہ کی وجہ سے جنم لے رہے ہیں۔

سعدیہ: بچوں کے سکرین ٹائم کی وجہ سے بے حد پریشان ہوں۔

سوال: آپ کا اپنا، سکرین ٹائم کتنا ہے؟

سعدیہ: مگر میں تو، دن بھر اتنے کام کاج بھی کرتی ہوں۔

سوال: تو کیا آپ کے بچے دن بھر میں اور کوئی کام نہیں کرتے؟

سعدیہ: نہیں، کرتے تو ہیں پر سب فضول کام۔۔

سوال: مثلاً کیا؟

سعدیہ: بس صبح اٹھتے ہیں رو دھو کے، سکول جاتے ہیں، دن کو تین بجے واپس، آ کر کھانا، پینا، کھیل، منہ چڑھا کر ٹیوشن جاتے ہیں، سپارے میں دھیان نہیں دیتے، جونہی وقت ملے تو موبائل موبائل کی ضد اور اس پہ لڑائیاں۔۔

سوال: تو، ان میں سے فضول کام کون سا ہے؟

سعدیہ: سوچ میں گم ہو کر، آگے بہت کچھ بتانا چاہتیں ہیں۔

تبصرہ یہ ہے کہ:

اصل میں وہ جن مسائل سے پریشان ہیں، وہ غالباً ان کو سمجھ نہیں پا رہی۔ سعدیہ خود بھی دن بھر اتنے ساری ایکٹیویٹیز نہیں کرتیں جتنی کہ اس وقت کے بچے کر رہے ہیں۔ ان میں سے وہ کام جو بچے کر رہے ہیں، دراصل بچوں کی نظر میں فضول ہیں۔ اس لیے وہ یہ کام کرنے پہ مائل نہیں، اور جواباً ردعمل ظاہر کرتے ہیں جو سعدیہ کے لئے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔

طاہر صاحب: آج کل کے بچوں نے پڑھائی کو تماشا بنا لیا ہے!

سوال: کیا مطلب؟ ذرا سمجھائیے تو؟

طاہر صاحب: ہر مضمون پہ، ہر کام پہ یہی کہتے ہیں، اس کا کیا فائدہ؟ یہ کیوں پڑھیں؟

سوال: تو کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے بچے سوچنے اور جاننے والے بنیں؟

طاہر صاحب: یہ کیا سوچ رہے ہیں اور جان رہے ہیں۔ سیدھا، سیدھا اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے نہیں پڑھنا۔

سوال: وہ یہ کہتے ہیں؟

طاہر صاحب: نہیں، لیکن مطلب یہی ہوتا ہے۔

یہ کہتے ہیں؟

طاہر صاحب: نہیں، لیکن مطلب یہی ہوتا ہے۔

سوال: تو، آپ ان کے سوال کو درست سمجھتے ہیں یا نہیں؟

طاہر صاحب: کس، سوال کو؟

سوال: یہی کہ ریاضی میں الجبرا پڑھنے کا، ملکوں کی، کمپیوٹر کی تاریخ پڑھنے کا کیا فائدہ؟ سکول میں پڑھنے کے وجود پھر ٹیوشن لینے کا۔ علیحدہ سے سپارہ پڑھنے کا۔

جواب سوچنے کی بجائے طاہر صاحب نے شکوہ بیان کیا کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو یہ نہیں کہتے تھے۔

سوال: کیا آپ کے والدین نے آپ کو زبردستی سکول بھیجا تھا۔

طاہر صاحب: نہیں میں تو لڑ بھڑ کے سکول داخلے کے لئے پہنچا تھا۔ دادی نے حمایت کی تھی میرے داخلے کی۔

سوال: اور آپ کے بچے؟

ان کو ہم لڑ بھڑ کے بھیج رہے ہیں۔

سوال: تو پھر اب آپ بتائیں کہ جو کام آپ سے زبردستی کروایا جائے، آپ کا رویہ کیا ہوگا؟

الغرض طاہر صاحب کے پاس مزید گفتگو کے لئے بے شمار الجھنیں ہیں، مگر وقت نہیں۔

وہ پریشان بھی ہیں اور الجھے ہوئے بھی، مگر پھر بھی ان کے پاس ان سنجیدہ مسائل کے لئے، ایک مرتب طریقے سے غور وخوض کا وقت نہیں۔

نصرت صاحبہ: بیٹا بہ ضد ہے کہ گاڑی چلاوں گا۔ اجازت کے بغیر گاڑی لے جاتا ہے۔

گاڑی چلانی آتی ہے اس کو؟

سوال: جی، پچھلے سال ہی اس کے بابا نے بڑے شوق سے سکھائی تھی اس کو۔

سوال: تو اب آپ کو اعتراض کیوں ہے؟

نصرت صاحبہ: اجازت کے بغیر لے جاتا ہے۔ ہر جگہ جانے کے لئے لاڈ صاحب کو گاڑی چاہیے۔

سوال: یہ تبدیلی یک دم آئی؟

نصرت صاحبہ: نہیں شروع شروع میں، اس کے بابا گھر نہیں ہوتے تھے تو میں سودا منگوالیا کرتی تھی۔ لیکن اس نے تو اب عادت بنالی ہے۔

سوال: جب آپ لوگوں نے اسے ڈرائیونگ سکھائی تو اس سے گفتگوئیں کی تھی؟

نصرت صاحبہ: کس، بارے میں؟

کہ کب چلانی ہے، قانون کیا ہے، کس عمر میں گاڑی کا لائسنس ملتا ہے، گاڑی کے بے جا استعمال کی عادت کب پڑتی ہے۔ اس کے نقصان کیا ہیں؟ آپ جن اصولوں کو مد نظر رکھ کر گاڑی کا استعمال کرتے ہیں وہ کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

نصرت صاحبہ: اس طرح خاص طور پہ تو نہیں پر جب بھی جاتا ہے تو میں سمجھاتی ہوں، منع بھی کرتی ہوں، اس کے بابا بھی اس کو ڈانٹتے اور سمجھاتے ہیں۔

کیا اس وقت وہ آپ کی بات، ڈانٹ، سمجھانا غور سے سنتا ہے؟

نصرت صاحبہ: کہاں جی، عجیب بے پروائی سے، ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہہ کر گردان اکڑا کر نکل جاتا ہے۔

تو آپ سوچ کر بتائیں کہ جب بچہ یا انسان کسی خواہش یا ضرورت میں ڈوبا ہوتا ہے، اور اسی کے زیر اثر ہو تو اس وقت بات سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے؟ کیا وہ وقت سمجھانے کے لئے مناسب ہوتا ہے؟ وہ اس وقت بات سنتا ہے یا ٹالتا ہے؟ ڈانٹنے اور سمجھانے میں کوئی فرق ہے کیا؟

سوال تو اس سے آگے بھی بہت ہیں، مثلاً بچوں تھرل کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟ گفتگو کے لئے مناسب وقت اور عمر کون سی ہے؟

مختلف عمر کے بچوں سے بات کیسے کرنی چاہیے؟

ایسے ہزاروں مکالمے لکھے جا سکتے ہیں۔ آج کل ہر چوتھا گھر، والدین اور بچوں کے بیچ ایک میدان جنگ بن چکا ہے، جہاں طاقت اور بڑے ہونے کے دھونس جما کر باتوں کو رد کیا جاتا ہے۔ جہاں بچے فرسٹریشن کا شکار ہو کر فرار کی راہوں پہ باہر نکل رہے ہیں یا سکرین اور بے کار مشغلوں کے شکار ہو رہے ہیں۔

اب آپ سامعین بتائیے کہ آپ کس مسئلے پر مکالمہ سننا چاہتے ہیں؟ کن مسائل پر، ان کے حل پر کس ترتیب سے آگاہی لینا چاہتے ہیں؟ آپ کے بچوں کی عمریں کیا ہے؟ بیک گراونڈ کیا ہے؟ آپ کس مسئلے پر سب سے زیادہ پریشان ہیں؟ گفتگو میں رکاوٹیں کیا ہیں؟

لیکن یہ سب آپ کو سوچنا ہو گا، وقت دینا ہو گا۔

جن والدین نے اپنے اس بنیادی فرض سے غفلت برتی، یقین جانیے آج کہ دور میں جبکہ سیکھنے کے مواقع اور ذرائع لا محدود ہو چکے ہیں، وہاں ہم اپنے بچوں کی تربیت کی مہارت اور آرٹ کو نہ سیکھ پائے تو خدا کے ہاں جواب دہی سے کیسے بچ پائیں گے؟

نعیم احمد بلوچ

اُمِّ موسیٰ: ایک بے مثل والدہ

اُمِّ موسیٰ سیدہ یوکبد کا شمار ان عظیم خواتین میں ہوتا ہے جن کی عظمت کی گواہی خود قرآن نے دی۔ انھوں نے اپنے رب پر ایسا بھروسا کیا جس کی مثال معلوم تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کے واقعے کو قرآن مجید میں بہت مختصر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ قرآن اور مقدس صحیفوں کی مدد سے حضرت موسیٰ کی پیدایش پر ان کی والدہ کے کردار کو ایک کہانی کی شکل دی گئی ہے۔

انسانوں کی یہ بستی بھی عجیب تھی۔ اس بستی میں رہنے والوں سے زیادہ ظلم شاید ہی کسی پر ہوا ہو۔ یہاں کے بادشاہ نے جو قانون بنا رکھا تھا اس سے پہلے وہ قانون کسی نے نہیں بنایا تھا۔ اس گھر میں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کے خاندان والے سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔

یوکبد اور عمران کے ہاں جب ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے بعد تیسرا بچہ پیدا ہوا تو وہ بھی خوش ہونے کے بجائے سخت خوفزدہ اور پریشان تھے۔ اس کی پریشانی کی وجہ وہ ظالمانہ قانون تھا جو یہاں کے حکمران نے نافذ کر رکھا تھا۔ اس قانون کے مطابق بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔

اس ظالمانہ قانون کے کئی سبب بیان کیے جاتے ہیں۔ سب سے قرین قیاس وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم ﷺ کے پوتے حضرت یوسف علیہ السلام یہاں پر کم و بیش تین سو برس قبل حکمران تھے۔ انھیں ملک مصر

کے ہاکسوس خاندان کے ایک بادشاہ نے یہاں کا حکمران بنایا تھا۔ ہاکسوس خاندان سے پہلے مصر پر قبطی خاندان کی حکومت تھی۔ یہ مصر کے مقامی باشندے تھے۔ اور ہاکسوس خاندان نے انھیں شکست دے کر حکومت حاصل کی تھی۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ قبطی خاندان حکومت حاصل کرنے میں دوبارہ کامیاب ہو گیا۔ انھوں نے اس وقت کے عام دستور کے مطابق اپنے دشمن خاندان کے حمایتیوں کو اپنا غلام بنالیا۔ یہ حضرت یوسف کی قوم بنی اسرائیل تھی۔ "اسرائیل" حضرت یعقوب کا لقب تھا۔ اس کا وہی مطلب ہے جو عربی میں عبداللہ کا ہے، یعنی اللہ کا بندہ۔

قبطی اپنے حکمرانوں کو "فرعون" کہتے تھے۔ یعنی ان کا ہر بادشاہ "فرعون" کہلاتا تھا۔ فرعونوں نے بنی اسرائیل کو

قابو میں رکھنے کے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ وہ ایک برس پیدا ہونے والے لڑکوں کو قتل کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ رکھتے۔ ام موسیٰ یوکبد کے ہاں جس برس بچہ پیدا ہوا تھا، اس برس قانون کے مطابق بچوں قتل کیا جا رہا تھا۔

نامور خواتین

فرعون کی جاسوس عورتیں بستی میں پھرتی رہتیں۔ انہیں جیسے ہی کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہونے کی خبر ملتی فوراً فرعون کے سپاہیوں کو خبر کر دیتیں اور وہ معصوم بچے کو قتل کر دیتے۔

یوکبد سخت پریشان تھیں کہ وہ بیٹے کو فرعون کے سپاہیوں سے کیسے بچائے۔ ان کے شوہر نے یقیناً اپنے طور پر اس کا کچھ انتظام کر رکھا ہوگا کہ کسی کو بیٹے کی پیدائش کی خبر نہ ہو۔ لیکن یوکبد کو ہر دم دھڑکا لگا رہتا ہوگا کہ جس دن ظالم بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی اسی دن وہ میرے اس خوب صورت اور روشن آنکھوں والے بچے کو لے جائیں گے۔ وہ دن رات اپنے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہتیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا، اسی قدر ان کے دل میں یہ خوف بڑھتا جاتا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یوکبد اپنے پیارے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر اللہ سے اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں کہ انھیں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے سرگوشی کی ہے۔ انھوں نے ارد گرد دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلے ہی بیٹھی تھی۔ سوچا کہ شاید یہ میرا وہم ہو لیکن انھیں دوبارہ آواز سنائی تھی۔ اس مرتبہ آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ انھیں کسی قسم کا شک نہ رہا کہ واقعی کوئی ان کا نام لے رہا تھا۔

انھیں جو کچھ کہا جا رہا تھا، اور جیسے بھی کہا گیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اے یوکبد جب تمہیں بچے کے معاملے میں خطرہ محسوس ہو تو اسے ٹوکری میں ڈال کر دریا میں چھوڑ دینا۔ دریا اسے کنارے پر دھکیل دے گا اور پھر ہمارا وعدہ ہے کہ ہم اس بچے کو محفوظ بھی رکھیں گے اور یہ تمہاری ہی گود میں پرورش پائے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔

یوکبد اللہ پر یقین رکھنے والی ماں تھی۔ وہ بنی اسرائیل کے اس خاندن سے تھیں جو نبیوں اور ان کی سکھلائی تعلیم پر یقین رکھتی تھیں۔ وہ اشارہِ غیبی کی روایت سے بخوبی واقف تھیں۔ انھیں پختہ یقین تھا کہ سرگوشی کسی اور نے نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور کوئی عام مطالبہ نہیں کیا جا رہا۔ اسے اپنے دل کے ٹکڑے کو ٹوکری میں رکھ کر دریا میں بہا دینے کا حکم کسی اور نے نہیں بلکہ اللہ نے دیا ہے۔ یہ ہرگز کوئی وہم یا شیطانی خیال نہیں۔

اس حکم کے بارے میں یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ یہ اللہ کا حکم ہے، انھوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کا ارادہ کر لیا۔ اپنی بیٹی مریم کو اپنا ہم راز بنایا اور اس کے ساتھ مل کر ایک ٹوکری لیا۔ اس پر اچھی طرح روغن کیا تاکہ پانی سے وہ خراب نہ ہو۔ اور پھر جیسے ہی مناسب موقع ملا، انھوں نے اپنے خوب صورت بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ٹوکری میں ڈالا اور بیٹی سے کہا کہ اسے خاموشی سے دریا میں بہا دو۔

یہ ایک ماں کا اللہ پر بھروسا ہی تھا جس نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے پیارے بیٹے کو دریا میں بہادے۔ اگرچہ انھیں اللہ پر مکمل یقین تھا لیکن پھر بھی انسان ہونے کے ناتے ان کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ معلوم نہیں ان کا جگر گوشہ دریا میں بہتے ہوئے کہاں جائے گا۔ اس لیے بیٹی مریم سے کہا کہ ذرا دیکھنا یہ ٹوکری جاتی کہاں ہے۔

بیٹی کو روانہ کر کے وہ اللہ سے اپنے بیٹے کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔ کچھ وقت گزرا تو ان کا انتظار طویل ہونے لگا۔ وہ بے چین ہو گئیں کہ اس کی بیٹی مریم واپس کیوں نہیں آ رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ٹوکری دریا میں بہانے کے بعد کدھر گئی ہے۔

طرح طرح کے خدشات نے یقیناً ان کے دل میں پیدا ہو رہے ہوں گے کہ فرعون کے کسی جاسوس نے تو اسے ٹوکری دریا میں بہاتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ سوچتیں کہ اگر ایسا ہوا تو سپاہی بچے کو قتل کرنے کے ساتھ ساتھ مریم کو بھی نہیں چھوڑیں گے لیکن پھر انھیں اللہ کا وعدہ یاد آیا اور مایوسی کے اندھیروں میں امید کا چراغ جل اٹھا۔ وہ اللہ سے مخاطب ہوئیں کہ اے اللہ مجھے تمہارے وعدے پر پورا پورا بھروسہ ہے لیکن کیا کروں، میں ایک ماں ہوں۔ دل بار بار خوف کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔

مریم کی آمد سے پہلے انھوں نے جس انتظار میں وقت گزارا ہو گا، اس کی شدت کا اندازہ شاید ہی کوئی لگا سکے۔ کئی گھنٹوں یا شاید ایک دن کے انتظار کے بعد مریم ہانپتی کانپتی گھر میں داخل ہوئی۔ ماں اس کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مریم نے کہا کہ ماں تیار ہو جاؤ، آپ میرے ساتھ فرعون کے محل میں جا رہی ہیں۔ ماں کا دل دھک سے رہ گیا۔ بولیں: کیا بیٹے کو بچانے کی کوشش میں مجھے سزا ملنے والی ہے؟

"نہیں دراصل میرا بھائی فرعون کے محل میں ہے۔" مریم نے رازداری سے بتایا۔

یہ خبر اور بھی پریشان کن تھی۔ "میرا بیٹا فرعون کے محل میں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا انہوں نے تمہیں ٹوکری کو دریا میں ڈالتے دیکھ لیا تھا۔" یہ خدشات بالکل فطری تھے۔

"نہیں ماں، ایسی بات نہیں۔ میرا بھائی محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ تمہارا بیٹا اور میرا بھائی ہے۔ اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق میرے بھائی کی حفاظت کی ہے۔"

تب یوکبد نے اصرار کیا کہ بیٹی مجھے پوری بات بتاؤ۔ مجھ میں مزید سوالات پوچھنے کی ہمت نہیں۔ مریم نے بتایا کہ جب میں نے ٹوکری کو دریا میں بہایا تو مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں ٹوکری کو دریا میں بہا کر چھپ گئی تھی اور پھر تھوڑے فاصلے سے دریا کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ ٹوکری ایک جگہ پر اُگی جھاڑیوں میں اٹک گیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ لیکن جلد ہی میں نے وہاں پر کچھ خواتین کو دیکھا۔ یہ مجھے شاہی محل کی عورتیں محسوس ہوئیں۔ انھوں نے ٹوکری کو وہاں سے نکالا اور اپنی مالکہ کے سپرد کر دیا۔ اب وہ سب خواتین محل کی طرف جانے لگیں۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح کنیز کے روپ میں اندر چلی گئی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مریم پہلے ہی سے محل میں کنیز ہوں۔

بہر کیف اس نے بتایا کہ ملکہ نے ٹوکری کو دریا کے کنارے جھاڑیوں میں دیکھا تو اس کو پانی سے باہر نکلوایا اور کھول کر دیکھا۔ اس میں خوب صورت بچہ تھا۔ بچہ ملکہ کو بہت پسند آیا۔ فرعون کی یہ ملکہ بے اولاد تھی، اُس نے اس خوب صورت بچے کو گود میں لینے کا سوچا۔ کچھ دیر مزید گزری تو یہ خبر مشہور ہوئی کہ بچے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کسی اسرائیلی نے بچے کو قتل سے بچانے کے لیے اسے دریا میں بہا دیا ہے۔

اور فرعون بھلا ایک اسرائیلی بچے کا یوں بچایا جانا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

یوکبد نے جب یہ واقعہ اپنی بیٹی کی زبانی یہاں تک سنا تو سخت بے چین ہوئیں مگر بیٹی نے دلاسا دیا کہ پریشان نہ ہوں۔ اللہ کے خصوصی کرم سے فرعون نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ فرعون جتنا ظالم ہے اس کی یہ ملکہ اتنی ہی رحم دل اور عقل مند ہے۔ اس نے اسے سمجھایا کہ میں اس بچے کو گود لینا چاہتی ہوں۔ میں اس کی پرورش محل ہی میں کروں گی۔ اس لیے یہ بڑا ہو کر ہمارا دشمن نہیں دوست ہو گا۔ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنے گا۔ اس کی دلیل بہت زوردار تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرعون کے ذہن کو موم کر دیا۔ بہر کیف انھوں نے کسی نہ کسی طرح فرعون سے یہ بات منوالی۔ اور اس نے ملکہ کو اجازت دے دی کہ وہ بچے کو گود لے سکتی ہے۔

یوکبد نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ اللہ کی قدرت پر حیران ہو رہی تھی کہ اس نے دشمن کے دل میں کیسے رحم پیدا کیا۔ مریم نے مزید بتایا کہ صرف یہی نہیں، اللہ کی کرشمہ سازی تو یہ ہوئی کہ میرے بھائی نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ ظاہر ہے اسے بھوک لگی تھی۔ وہ دودھ پینے کے لیے رو رہا ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود بھائی نے محل میں موجود کسی آیا کا دودھ نہیں پیا۔ دودھ پلانے والی کئی عورتیں محل میں موجود تھیں۔ ان سب کو بلایا گیا لیکن بھائی نے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ سارے محل میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ ملکہ نے جس بچے کو گود میں لیا ہے وہ کسی آیا کا دودھ نہیں پی رہا۔ پھر میرے دل میں نہ جانے کیا بات آئی۔ میں نے ایک کنیز سے کہا کہ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو بچے کو دودھ پلانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ وہ کنیز اسی وقت ملکہ کے پاس پہنچی۔ ملکہ کا یہ سننا تھا کہ مجھے بلا بھیجا۔ میں نے ملکہ کو یقین دلایا کہ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں ایک ایسی عورت کو یہاں لاؤں گی جس کا دودھ یہ بچہ ضرور پیے گا اور ماں میں سیدھی تمہارے پاس آ پہنچی ہوں۔ دیکھو اللہ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا کیسا شان دار انتظام کیا ہے۔

یوں اللہ نے یوکبد کے بھروسے کا مان رکھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ فرعون کے محل میں تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا پیارا بچہ بھوک سے رو رہا ہے اور اسے کسی کی آغوش میں چین نہیں آ رہا۔ بلک بلک کر رو رہا ہے۔ کنیزوں نے ایک جمگھٹا اس کے ارد گرد لگا رکھا ہے لیکن اسے کسی کی گود میں وہ اپنایت اور محبت نہیں مل رہی جو اسے چپ کرا دے۔ پھر یوکبد نے اسے ملکہ کی اجازت سے اپنی گود میں لیا تو وہ پر سکون ہو گیا۔ اور دودھ پینے لگا۔ یقیناً ننھے موسیٰ نے ماں کی گود پہچان لی ہو گی۔

اللہ تعالیٰ نے یوکبد سے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اس کی حفاظت کے لیے دشمن کا محل فراہم کر دیا اور ماں کی ممتا کو

ٹھنڈک پہنچانے کے لیے ان کا بچہ ان کی جھولی میں ڈال دیا۔ ماں کی بھروسے کا اللہ نے صرف یہی انعام نہیں دیا بلکہ یہ بچہ بڑا ہو کر اللہ کے ممتاز ترین رسولوں میں سے ایک رسول بنا۔

نوٹ: فرعون کی جس بیوی کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق دی کہ وہ ننھے موسیٰ کو گود میں لے، ان کا نام عام طور پر "آسیہ" بیان کیا جاتا ہے۔ پیغمبر کی ماں نہ ہونے کے باوجود ان کی نگرانی میں حضرت موسیٰ کی اعلیٰ سطح پر دیکھ بھال ہوئی اور انھیں اپنی حقیقی ماں کی گود نصیب ہوئی۔ قرآن مجید میں ان کا نام تو نہیں ہے لیکن سورۃ تحریم کی آیات سے واضح ہے کہ وہ ایمان لائیں اور ان کی دعائیں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہیں کہ اللہ میرے لیے جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے برے کاموں سے نجات دے اور آلِ فرعون جیسی ظالم قوم سے مجھے بچا۔ جب حضرت موسیٰ کے بارے میں فرعون کو معلوم ہو گیا کہ ان کے ہاتھوں سے قبطی کا قتل ہو گیا ہے تو اس نے حضرت موسیٰ کو قتل یا گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ آسیہ ہی تھیں جنھوں نے نوجوان موسیٰ تک اس فیصلے کی خبر پہنچائی اور وہ مصر سے ہجرت کر کے مدین چلے گئے۔ کچھ روایات کے مطابق جب ان کے مسلمان ہونے کا علم فرعون کو ہوا تو اس نے انھیں شہید کرا دیا۔

تحریر: صباحت واحدی
ترجمہ: وجیہہ حسان واحدی

لائبریری کی پائیدار اہمیت

آج ہم ایک ایسے دور میں ہیں جہاں معلومات ہر جگہ موجود ہیں، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز ہماری روزمرہ کی زندگی پر تیزی سے غلبہ پا رہے ہیں، لائبریریوں کی اہمیت ختم ہوتی دکھائی دی جاسکتی ہے۔ پھر بھی تاریخ گواہ ہے کہ لائبریری کا مطلب محض کتابوں کے ایک وسیع ذخیرے سے بہت زیادہ ہے۔ وہ ہمیشہ سے ثقافت، علم اور شہری مشغولیت کے متحرک مراکز رہے ہیں۔ اسکندریہ کی قدیم لائبریری سے لے کر جدید دور کی پبلک لائبریری تک، ان اداروں نے انسانی تاریخ کی تشکیل، فکری ترقی اور معاشرتی بہبود میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایک ایسے دور میں جہاں فون یا کمپیوٹر کی سکرین کتابوں کی جگہ لیتی نظر آتی ہے، لائبریریوں کی مسلسل اہمیت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔

ایک وہ دور تھا

لائبریری کہاں سے آئی؟ اس کی ابتداء قدیم تہذیبوں سے ملتی ہے۔ اسکندریہ کی لائبریری، ابتدائی اداروں میں سب سے مشہور، قدیم دنیا میں علم کے سب سے بڑے ذخیرے میں سے ایک سمجھی جاتی تھی۔ مصر میں قبلِ مسیح تیسری صدی میں قائم کی گئی، وہ ایک ایسا شاہکار تھی جس میں سیکڑوں ہزاروں طومار (وہ کپڑا یا چمڑا وغیرہ جس پر تحریر لکھ کر لپیٹ دی جائے) رکھے گئے تھے، جو بحیرہ روم اور اس سے باہر کے اسکالرز کو راغب کرتے تھے۔ افسوس کہ اگرچہ اس کو المناک طور پر تباہ کر دیا گیا تھا، لیکن اس کی میراث آج بھی برقرار ہے: علم کی پیاس اور فکری کامیابیوں کو محفوظ رکھنے کی اہمیت کے طور پر۔

یورپ میں، قرونِ وسطیٰ کے دور میں خانقاہی کتب خانے، کلاسیکل دنیا کے تحریری کاموں کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ یہ خانقاہیں ان چند جگہوں میں شامل تھیں جہاں کتابیں ہاتھ سے کاپی کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کی جاتی تھیں۔ لائبریری، اگرچہ عام لوگوں کے لیے کم قابلِ رسائی تھی، لیکن دورِ تاریک میں سیکھنے کا تسلسل وہیں قائم رہتا تھا۔ یہیں پر قدیم یونانی اور رومن متون کی بقا کو یقینی بنایا گیا جس نے کئی برسوں بعد نشاۃِ ثانیہ تک کو ہوا دی۔

پندھرویں صدی میں پرنٹنگ پریس کی آمد ہوئی اور اسی کے ساتھ، کتابیں زیادہ وسیع پیمانے پر دستیاب ہونے لگیں، عوامی کتب خانوں کا تصور شکل اختیار کرنے لگا۔ پہلی عوامی لائبریری، جیسے ایک ایڈنبرا میں ۱۶۹۱ء میں قائم کی گئی تھی، ان کو ایسے ڈیزائن کیا جاتا تھا تاکہ آبادی کے وسیع تر طبقے کو کتابوں اور علم تک رسائی فراہم کی جا سکے۔ انیسویں اور بیسویں صدیوں تک، لائبریریاں، دنیا بھر کے ممالک میں، بنیادی عوامی ڈھانچے کے ضروری حصے کے طور پر ابھرنا شروع ہوئیں، جن کی توجہ معلومات تک رسائی کو جمہوری بنانے اور خواندگی کی حمایت پر مرکوز تھی۔

ہندوستانی ریاضی دان ایس آر رنگناتھن نے ۱۹۳۱ء میں، لائبریری سائنس کے پانچ بنیادی اصول تجویز کیے، جنہیں اب "رنگناتھن کا کوڈ" کہا جاتا ہے۔ یہ پانچ بنیادی قوانین آج تک ہر لائبریری کے مشن کے مرکز میں ہیں۔ تقریباً ایک سو سال پہلے شائع ہونے والے اپنے پانچ قوانین میں، رنگناتھن نے لائبریری کی روح کے بارے میں بات کی تھی—جو ایک ایسی اہم قوت ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ قائم رہتی ہے اور نا صرف یہ بلکہ کتابوں،

نظریات اور علم کی پیاس سے پیدا ہوتی ہے۔

یہی وہ توانائی تھی جو جاوید احمد غامدی صاحب کو بار بار لاہور کی پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس لائبریری کی طرف کھینچتی تھی۔ یہ باوقار وسائل کا مرکز ۱۸۸۲ء میں وجود میں آیا تھا اور ایک صدی سے زائد عرصے تک اپنی اصل تاریخی عمارت میں رہا۔ ایک پرجوش اور مشتاق طالب علم کے طور پر، غامدی صاحب جوابات کی تلاش میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے کے قیمتی علمی اثاثوں میں علمی موتی تلاش کرتے۔ ایک عام سی شام ہی تھی جب ایک دلچسپ عنوان نے ان کی توجہ حاصل کی، نظام القرآن! مصنف: حمید الدین فراہی۔ یہ وہ مقام تھا جب انہوں نے کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اس خزانے کو پہلے سے آخری صفحے تک پڑھ ڈالا اور غامدی صاحب کو اپنی زندگی کو بدل دینے والی پیش رفت محسوس ہوئی جس نے ہمیشہ کے لیے اسلام کے بارے میں ان کی سمجھ کو بدل دیا۔

ایک آج کا دور ہے

جیسے جیسے ڈیجیٹل دور پھیلتا جا رہا ہے، لائبریری کو بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلنا پڑ رہا ہے، لیکن اس کا بنیادی مشن برقرار ہے: سیکھنے اور سماجی مساوات کو فروغ دینا اور خیالات کے آزادانہ تبادلے کو یقینی بنانا۔ ایک لائبریری نہ صرف کتابوں کی تقسیم کے لیے بلکہ کمیونٹی کی تعمیر، ثقافتی مشغولیت اور تاریخ کے تحفظ کا مرکز ہے۔

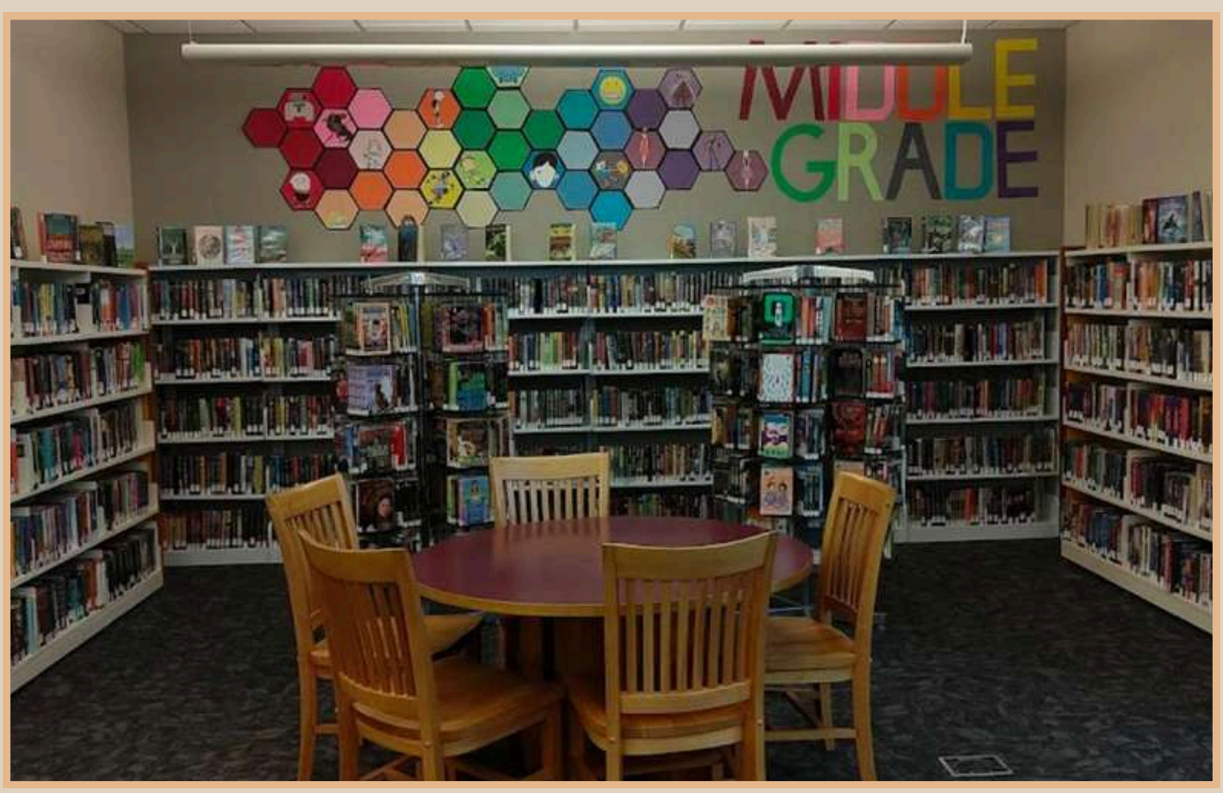

آج کی دنیا میں، یہ سمجھنا آسان اور عام ہے کہ انٹرنیٹ نے معلومات کے بنیادی ذریعہ کے طور پر لائبریریوں کی جگہ لے لی ہے۔ ورلڈ وائڈ ویب کے وسیع وسائل، اکثر ہماری انگلیوں پر علم کی ناقابل تصور مقدار تک فوری رسائی فراہم کرتے ہیں۔ ہاں! یہ بات سچ ہے کہ ڈیجیٹل وسائل کا اس بات پر گہرا اثر ہے کہ آج ہم معلومات تک کیسے پہنچتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ لائبریری اور لائبریرین کی پائیدار اہمیت کی نفی نہیں کرتا۔ کسی مصنف نے مختصر طور پر نہایت گہری بات کی: "گوگل آپ کے لیے ایک لاکھ جوابات لا سکتا ہے۔ لیکن ایک لائبریرین آپ کے لیے "صحیح" جواب لا سکتا ہے۔"

اب دیکھیں، آج دنیا کے بڑے ممالک میں ایک لائبریری صرف کتابوں کی نہیں رہی۔ وہ ایک متحرک کمیونٹی ہب ہے جو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لے کر تعلیمی پروگراموں، ثقافتی تقریبات اور سماجی رابطوں کے لیے جگہ تک کی خدمات فراہم کرتی ہے۔ بہت سے علاقوں میں، لائبریریاں ڈیجیٹل وسائل تک مفت رسائی کی پیشکش کرتی ہیں جو کم آمدنی والے افراد کے لیے ایک بہت بڑی سہولت ہو سکتی ہیں جو ذاتی آلات یا انٹرنیٹ کی خریداری یعنی سبسکرپشنز کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ڈیجیٹل برابری شاید ایک لائبریری کا سب سے اہم فعل ہے۔ یہ مرکز اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ہر شخص کو، بھلے اس کی سماجی حیثیت جیسی بھی ہو، ڈیجیٹل دنیا میں سیکھنے جڑے رہنے اور بڑھنے کا موقع ملے۔

اس سلسلے میں اچھی مالی اعانت والی لائبریریاں خاص طور پر اہم ہیں۔ جب لائبریریوں کو مناسب مالی مدد ملتی ہے، تو وہ اپنی سماج کی ترقی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اپنی خدمات کو بڑھا سکتی ہیں۔ اس میں ڈیجیٹل انفراسٹرکچر میں سرمایہ کاری شامل ہے، جیسے کہ تیز رفتار انٹرنیٹ، کمپیوٹر ٹرمینلز، اور ای کتابوں تک رسائی فراہم کرنا، لوگوں کو ڈیجیٹل خواندگی کی مہارتیں حاصل کرنے کے لیے تربیتی پروگرام پیش کرنا۔ اس سے آگے بڑھ کر، لائبریریاں اکثر ملازمت ڈھونڈنے والوں کے لیے وسائل پیش کرتی ہیں، جن میں کیریئر ڈویلپمنٹ، ورکشاپس اور پیشہ ورانہ ڈیٹا بیس تک رسائی شامل ہے، جس سے افراد کو جاب مارکیٹ کے چیلنجز تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب بہت ساری سماجی خدمات کو ختم یا پرائیویٹائز کیا جا رہا ہے، لائبریری تمام پس منظر کے افراد کے لیے ایک نایاب، عوامی اور غیر تجارتی پلیٹ فارم پیش کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ بنی رہتی ہے جہاں لوگ خیالات کے ساتھ مشغول ہو سکتے ہیں، نئی دلچسپیاں تلاش کر سکتے ہیں، اور ایسے رابطے بنا سکتے ہیں جو ڈیجیٹل سکرین سے بھی کہیں آگے نکل جائیں۔ آج جب ہم پیچیدہ عالمی چیلنجز کا سامنا کر رہے ہیں، جیسے موسمیاتی تبدیلی، سیاسی تقسیم، اور سماجی عدم مساوات —— ایک لائبریری کیا کر رہی ہے؟ وہ عکاسی، مکالمے اور اجتماعی تقاریب کے لیے ایک جگہ فراہم کرتی ہے۔

مثال کے طور پر، امریکہ میں، پبلک لائبریری ایسوسی ایشن (پی ایل اے) نے رپورٹ کیا ہے کہ ۹۹% سے زیادہ پبلک لائبریریاں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تک مفت رسائی کی پیشکش کرتی ہیں، اور بہت سے ٹیوشن پروگرام، مختلف کورسز، اور یہاں تک کہ دماغی صحت سے متعلق وسائل فراہم کرتی ہیں۔ ماڈرن کیفے میں کھانے پینے کی چیزیں خریدے بغیر، وہاں بیٹھنے پر منع کیا جا سکتا ہے، لیکن پبلک لائبریری کی حدود میں ایسی کوئی شرائط موجود نہیں ہے۔ یہ بات بھی دل کو تسلی دیتی ہے کہ امریکہ میں سٹار بکس سے زیادہ عوامی لائبریریوں کی تعداد ہے!

ایک اچھی منظم لائبریری کا مقام، کتابوں سے بھری عمارت سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ کمیونٹی کی ایک سندِ بنیاد ہے۔ جب لائبریریوں کو اچھی مالی مدد کی جاتی ہے تو وہ متحرک ادارے بن جاتے ہیں جہاں متنوع ذوق اور صلاحیتوں کے لوگ اکٹھے ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے سے سیکھ سکتے ہیں اور مشترکہ تجربات میں مشغول ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے لیے، لائبریری ایسی جگہ ہوتی ہیں جہاں ان کے تخیلات کو جنم دیا جاتا ہے، جہاں ان میں معلومات کی خواندگی، ہمدردی، اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

اچھی مالی اعانت سے چلنے والی لائبریری کا سب سے زیادہ واضح اثر تعلیمی مواقع میں اضافہ ہے۔ پبلک لائبریری سے بچوں اور بڑوں کو اہم اضافی تعلیمی وسائل میسر ہوتے ہیں۔ اسکول کے بعد کے پروگرام، گرمی کی چھٹیوں میں پر لطف مطالعے کی مصروفیت اور ہوم ورک ہیلپ سینٹرز کے طور پر، لائبریریاں طلباء کی تعلیمی کامیابی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ خاص طور پر ان کمیونٹیز میں زیادہ اہم ہے جہاں اسکولوں کو فنڈز کی کمی ہو سکتی ہے۔ تحقیق نے مسلسل یہی دکھایا ہے کہ کتب خانوں کا خواندگی کی نشوونما پر مثبت اثر پڑتا ہے، خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے۔

امریکہ کے شہر ہوسٹن میں ایک پبلک لائبریری ایسی جگہ ہے جو زندگی بھر سیکھنے کو فروغ دیتی ہے۔ چاہے وہ زبان کے کورسز ہوں، کمپیوٹر کلاسز یا مختلف موضوعات پر ورکشاپس، لائبریری لوگوں کو اسکول کی رسمی تعلیم وتربیت سے باہر اپنی تعلیم جاری رکھنے کے قابل بناتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر کمیونٹی کی مضبوطی پر پڑتا ہے، کیونکہ افراد بدلتے ہوئے روزگار کی مارکیٹ، ٹیکنالوجی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے ضروری مہارتیں اور علم حاصل کرتے ہیں۔

ایک اچھی لائبریری کا اہم فائدہ شہری مشغولیت اور کمیونٹی کی شمولیت کو فروغ دینا ہے۔ لائبریریاں اکثر ایونٹس کی میزبانی کرتی ہیں جیسے ٹاؤن ہال میٹنگز، ووٹنگ رجسٹریشن ڈرائیوز، اور مقامی صحافیوں کی ریڈنگ جن کو عوام کی شرکت سے حوصلہ افزائی ملتی ہے۔ وہ ایک ایسی جگہ فراہم کرتی ہیں جہاں متنوع پس منظر کے افراد بامعنی گفتگو میں مشغول ہو سکتے ہیں اور مقامی، قومی اور عالمی مسائل کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ آج کل کے پولرائزڈ سیاسی ماحول میں، لائبریری ایسے پروگرام پیش کر کے تقسیم کو ختم کرنے میں مدد کر سکتی ہے جو ہمدردی، احترام اور کھلے ذہن کو فروغ دے۔

کامکس اور کہانیوں کی دنیا

صدیوں سے، کہانیاں، خواہ وہ زبانی ہوں یا تحریری، انسانی ثقافت کا ایک لازمی حصہ رہی ہیں۔ کہانیاں بچوں کو اپنے ارد گرد کی دنیا کا احساس دلانے، ہمدردی پیدا کرنے اور نئے خیالات اور نقطہ نظر کو دریافت کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ خاص طور پر نوجوان لائبریرین طویل عرصے سے کہانی سنانے کے چیمپئن رہے ہیں، جو بچوں کو ایسی کتابوں کی ایک وسیع رینج پیش کرتے ہیں جو تخلیقی صلاحیتوں کو جنم دے سکتی ہیں اور دنیا کے بارے میں ان کی سمجھ کو بڑھا سکتی ہیں۔

حالیہ برسوں میں، گرافک ناولز اور کامکس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے بچوں کے ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ کامکس کہانی سنانے کا ایک انوکھا انداز پیش کرتا ہے جو بچوں کو ایسے طریقوں سے مشغول کرتا ہے جو روایتی کتابیں نہیں کر سکتیں۔ خاص کر کے وہ بچے جنہیں پڑھنے میں زیادہ دلچسپی نہ ہو، ان کے لئے گرافک ناولز ادب کے ساتھ مشغول ہونے کا ایک دلکش طریقہ فراہم کرتے ہیں۔ وہ ایک بصری بیانیہ پیش کرتے ہیں جو فہم میں مدد کرتا ہے اور بچوں کو تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ کی دنیا اور پڑھنے کی مہارت کو بڑھانے کی اجازت دیتا ہے۔

آپ کبھی غور کیجیے گا کہ کامکس اپنے پر کشش اور متعلقہ کرداروں کے ذریعے اکثر پیچیدہ موضوعات کو تلاش کرتے ہیں جیسے شناخت، ہمارے اندر کی مضبوطی، سماجی انصاف۔ کامکس متنوع پس منظر سے تعلق رکھنے والے بچوں کے لیے دل چسپ اور مزاحیہ مواد میں عملی شمولیت کا احساس فراہم کرتے ہیں۔ یہ بچے اپنی پڑھی ہوئی کہانیوں میں خود کو جھلکتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔

ایسی ہی ایک کہانی "شاامانت "اور "جی وِلووِلسن" کی تصنیف کردہ، مس مارول کی ہے۔ اس سیریز میں ایک سپر ہیرو کمالہ خان کا کردار ہے، جو کہ نیو جرسی سے تعلق رکھنے والی ایک امریکی نوجوان ہے۔ اس کا گھرانہ پاکستانی دکھایا ہے، جو برسوں پہلے ایک بہتر زندگی کی تلاش میں امریکہ آگئے تھے۔ اس شاندار کامک کے صفحات میں نہ صرف دیسی خاندانی زندگی کے دکھائے گئے مناظر کو پڑھ کر خوشی ہوتی ہے، بلکہ اس سیریز کی حیرت انگیز اسکرین موافقت کو دیکھ کر بھی بہت مزاہ آتا ہے۔

یہ لائبریری ہی تو ہے جو بچوں کو بک کلب جیسے پروگراموں کے ذریعے زندگی بھر پڑھنے کا شوق پیدا کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ہفتے کی دوپہر میں ہوسٹن کی کسی بھی لائبریری میں چہل قدمی کریں، آپ ہر عمر کے بچے کو تفریحی اور تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول پائیں گے۔ لیگو پلے، سائنس کے تجربات، اور کوڈنگ روبوٹس سے لے

کر ویڈیو گیمز اور آرٹ کے مقابلوں تک ہر چیز -- ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ آج کے بہت سے نوجوان تنہائی کے دور میں پروان چڑھ رہے ہیں، لائبریریاں ان کے لیے گھر اور اسکول کی حدود سے باہر دوسروں سے تعلق قائم کرنے کا طریقہ پیش کرتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ :

آج کی تیز رفتار ٹیکنالوجی کی ترقی کے پیش نظر، انسانی تاریخ پر لائبریریوں کے گہرے اثرات کو بھولنا آسان نہیں ہے۔ لائبریری محض ماضی کے آثار میں سے نہیں ہے، یہ وہ اہم ادارہ ہے جو علم سیکھنے کو فروغ دیتا رہتا ہے، تخلیقی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لائبریری ایسے طریقوں سے سماج کی مدد کرتی ہے جس کو ڈیجیٹل پلیٹ فارم آسانی سے نقل نہیں کر سکتے۔

لائبریری بچوں کو کہانیوں کا جادو دریافت کراتی، ان کے تخیلات کو پروان چڑھاتی اور زندگی بھر پڑھنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ یہ ابتدائی تجربات، بدلے میں، بچوں کو ہمدردی، تنقیدی سوچ، اور دنیا کی گہری تفہیم پیدا کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ڈیجیٹل دور میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہمیں لائبریری کی پائیدار قدر کو پہچاننا چاہیے اور اس کی حمایت کے لیے ٹھوس کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی مقامی لائبریری کا دورہ کر کے، اس کے پروگراموں کی حمایت کر کے، اور فنڈنگ کی وکالت کر کے، آپ اس بات کو یقینی بنانے میں مدد کر سکتے ہیں کہ لائبریری متحرک، قابل رسائی اور آنے والی نسلوں کے لیے برقرار رہیں۔

کہانی

نعیم احمد بلوچ

جڑوں کی حفاظت

بطور خاص ان والدین کے لیے جو اپنی تہذیبی اور ثقافتی جڑوں سے جڑے رہنا چاہتے ہیں۔
اپنی زبان کو نئی نسل میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی نسل کو اپنی شناخت دینا چاہتے ہیں

رات گہری ہو چکی تھی، لیکن زاہد ابھی تک اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کمرے میں ایک دھیمی زرد روشنی تھی، جو پر سکون مگر کسی قدر اُداس سا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ میز پر کتابوں کا ایک ڈھیر لگا تھا، جن میں سے کچھ اردو ادب کی تھیں اور کچھ مغربی فلسفے پر۔ ایک طرف چائے کا کپ رکھا تھا، جس کی بھاپ اٹھنا کب کی بند ہو چکی تھی۔ کمرے کی ٹھنڈک اس کی حدت کو کھا چکی تھی۔ زاہد کے ہاتھ میں ایک پرانی سی بڑی کتاب تھی۔ وہ تو اسے یادوں کا دریچہ کہتا تھا مگر اس کے بچے اسے "فیملی البم" کہتے۔

البم کھولتے ہی سب سے پہلی تصویر اس کے والد کی تھی۔ یہ پاکستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں لی گئی تصویر تھی۔ ان کے والد سفید کرتا، تہہ بند اور ایک خالص دیہاتی طرز کی چادر کی بکل مار کر کھیتوں کے کنارے کھڑے تھے۔ تصویر دیکھ کر زاہد کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی، لیکن ساتھ ہی دل میں ایک سوال جاگ اٹھا: "کیا میرے بچے بھی کبھی ان جڑوں کو سمجھ سکیں گے؟ کیا انہیں یہ معلوم ہو گا کہ ہم کہاں سے آئے تھے؟"

زاہد کی زندگی کا بڑا حصہ مغرب میں گزرا تھا۔ وہ یہاں اپنی محنت اور علم کی بدولت ایک کامیاب انجینئر بن چکا تھا۔ ایک خوب صورت گھر، اچھی نوکری اور خاندان کی ہر آسائش کے ساتھ زندگی بظاہر مکمل لگتی تھی، لیکن دل

کہانی

کے کسی کونے میں ایک انجانا سا خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ یہ خوف تھا کہ اس کے بچے، جو مغربی معاشرے میں پل بڑھ رہے تھے، کہیں اپنی ثقافت کو نہ کھو دیں۔ اپنی شناخت نہ گم کر دیں۔

اس کا سب سے بڑا خوف تھا کہ اس کے بچے مغربی تہذیب کا حصہ بنتے بنتے اس ثقافت سے دور نہ ہو جائیں، جسے وہ اپنا فخر سمجھتا تھا۔ یہ حلال و حرام کی تمیز، یہ حفظِ مراتب کا لحاظ، یہ حدود آشنائی، یہ پاکی پلیدی کا فرق۔۔۔ جب اس کی بیٹی آمنہ، جو صرف تیرا برس کی تھی، کسی بات پر اردو کے بجائے انگریزی میں جواب دیتی، تو زاہد کا دل عجیب طرح سے ڈوبنے لگتا۔ "بابا، اردو مشکل ہے۔ یہاں سب انگریزی بولتے ہیں،" آمنہ کی معصومیت زاہد کو اندر سے ہلا دیتی۔ زبان محض زبان نہیں ہوتی، یہ اپنے ساتھ تہذیبی روایات اور ثقافتی عناصر بھی لاتی ہے۔

صرف زبان ہی کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ماحول اور تمدن مغرب میں بچوں کو بہت جلد آزاد اور خود مختار بنا دیتا تھا۔ یہ اچھی چیز تھی لیکن اس کے ساتھ کچھ آفات بھی تھیں۔ وہ تہوار، جو زاہد کے بچپن میں پورے خاندان کے ساتھ منائے جاتے تھے، یہاں صرف چھوٹے سے خاندان تک محدود ہو چکے تھے۔ عید کی نماز پر بچوں کو لے جانا اب ایک جدوجہد بن چکا تھا۔ انہیں صبح اٹھانے سے زیادہ مشکل یہ سمجھانا تھا کہ عید کا مطلب صرف نئے کپڑے یا پیسے لینا نہیں بلکہ قربانی اور شکر گزاری ہے۔

زاہد اکثر اپنی بیوی صائمہ سے اس بارے میں بات کرتا۔ صائمہ، جو خود بھی اس خوف کا شکار تھی، کہتی: "ہمیں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، زاہد۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ یہ بچے اس معاشرے میں رہ رہے ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو انہیں اس ماحول سے الگ نہیں کر سکتے۔"

زاہد کے لیے یہ بات مان لینا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مغربی معاشرہ اپنی آزادی، انفرادی حقوق اور لذت پسندی پر مبنی ہے۔ وہ معاشرہ جہاں "میری مرضی" سب کچھ ہے۔ یہاں کا فلسفہ افادیت ایثار، قربانی، صبر اور برداشت کی خوبیوں پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ وہ دنیا تھی جہاں بچوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ "اپنی خوشی سب سے اہم ہے۔" یہ محبت کی جگہ مفاد، فرائض کی جگہ حقوق میں عدم توازن پیدا کر سکتا ہے۔

ایک دن، زاہد نے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ایک فیصلہ کیا۔ اس نے کہا: "ہم ہر ہفتے ایک شام اپنی ثقافت کے لیے رکھیں گے۔ ہم اردو بولیں گے، دیسی کھانے کھائیں گے، اور اپنے ملک کی کہانیاں سنائیں گے۔"

بچوں نے پہلے تو اعتراض کیا، لیکن آمنہ اور زاہد کے بیٹے علی نے جب پہلی کہانی سنی، تو انھیں بہت دل چسپی محسوس ہوئی۔ زاہد نے انہیں دادا جان کی کہانی سنائی کہ کیسے وہ گاؤں سے نکل کر ایک نئے ملک میں آئے اور اپنی

محنت سے ایک نئی زندگی بنائی۔

آمنہ نے کہا: "بابا، دادا جان کی کہانی فلم جیسی ہے۔ کیا میں اس پر لکھ سکتی ہوں؟" زاہد کے چہرے پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔

یہ آسان سفر نہیں تھا۔ بچوں کے ساتھ مغربی تہذیب کی کشش کو متوازن رکھنا ایک مسلسل جدوجہد تھی۔ لیکن زاہد نے سیکھ لیا تھا کہ یہ جدوجہد ترک کرنا ایک بڑی شکست ہو گی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنی اولاد کو مکمل طور پر اپنے ماضی کا حصہ نہیں بنا سکتا، لیکن وہ یہ ضرور کر سکتا تھا کہ انہیں اس ماضی سے جوڑے رکھے۔ یہ ان کی جڑیں تھیں، اور جڑوں کے بغیر درخت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے۔

زاہد نے بچوں کو اپنی ثقافت سے جوڑنے کی جو کوشش شروع کی تھی، وہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ یہ ایک مسلسل جنگ تھی، جو ہر روز ایک نئی شکل میں سامنے آتی تھی۔ مغربی ماحول نے ان کے بچوں کو ایک ایسی شناخت دے دی تھی، جو زاہد اور صائمہ کی جڑوں سے مختلف تھی۔ یہ فرق کبھی لباس کی شکل میں ظاہر ہوتا، کبھی موسیقی کی، کبھی تعلقات کی، اور کبھی زبان کی۔

ایک دن آمنہ اسکول سے واپس آئی اور اس نے صاف کہہ دیا: "بابا، میں عید پر وہ کپڑے نہیں پہنوں گی جو آپ اور امی نے بنائے ہیں۔ سب مجھ پر ہنسیں گے۔" زاہد حیران رہ گیا۔ آمنہ کی بات میں شرمندگی اور خوف تھا۔ یہ اس کے چہرے پر عیاں تھا۔

"بیٹا، یہ ہمارے روایتی کپڑے ہیں، ان میں شرمندگی کیسی؟" زاہد نے نرمی سے پوچھا۔

"بابا، سب بچے جینز اور ٹی شرٹ پہنتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ میں عجیب لگ رہی ہوں۔" آمنہ نے جواب دیا۔

یہ زاہد کے لیے ایک دھچکا تھا۔ اس کے ذہن میں وہ دن گھومنے لگے جب اس کے گاؤں میں عید کا دن خوشیوں کا پیامبر ہوتا تھا۔ نئے کپڑوں کی خوشبو، لوگوں کی تعریف، اور خاندان کے ہر فرد کی گرم جوشی۔۔۔ یہ سب آج کے مغربی ماحول میں کھو چکی تھی۔

علی، زاہد کا بیٹا، اپنے کمرے میں ہپ ہاپ گانے سن رہا تھا۔ زاہد نے دروازہ کھولا تو ایک بار پھر حیران ہوا۔

"علی، مجھے یہ میوزک ہماری مشرقی موسیقی کے مقابلے میں اچھل کود اور شور شرابا زیادہ لگ رہا ہے۔ اس میں میوزیکل انسٹرومنٹ کی آواز شاعری پر حاوی ہے۔۔۔ آخر اس موسیقی میں کیا کشش ہے؟"

کہانی

بابا، یہ میوزک زبردست ہے! سب یہی سنتے ہیں۔ آپ بھی تو کلاسیکل موسیقی جس میں صرف سُر وغیرہ ہی کی ہانک لگائی جاتی ہے، بے معنی لفظوں کی تکرار کی جاتی ہے، پسند نہیں کرتے۔۔۔ اسی طرح ہمیں یہ قوالی بہت بورنگ لگتی ہے۔ یہ تالیاں بجانا کتنا احمقانہ میوزک ہے! لگتا ہے مچھر مار رہے ہیں۔ یہ آآآآ۔۔۔ سارے، کاما، پادا ۔۔۔ یہ کیا چیز ہوئی بھئی؟" اس نے باقاعدہ ہانک لگائی۔

آمنہ، علی کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسی تو زاہد بہت بدمزا ہوا۔ مگر اس کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ صرف موسیقی کا مسئلہ نہیں ہے، یہ اس جڑ سے کٹنے کی علامت تھی جو بندروں کی طرح ناچنے کودنے کو موسیقی قرار دیا جا رہا ہے۔ اسے قوالی ایک روحانی تجربہ لگتی تھی مگر اب علی کے لیے محض "بورنگ" ہو گئی تھی یا مچھر مارنے والی حرکت۔

ایک اور دن، دادی نے زاہد سے شکایت کی: "بچے مجھ سے بات بھی ٹھیک سے نہیں کرتے۔ ہر بات پر سوال کرتے ہیں۔ پہلے بچے بڑوں کی بات کو مان لیتے تھے، اب تو ہر بات میں بحث کرتے ہیں۔"

زاہد نے آمنہ کو بلایا اور پوچھا: "بیٹا، دادی کو کیوں جواب دیتی ہو؟ وہ تم سے پیار کرتی ہیں اور تمہیں نصیحت کرتی ہیں۔"

"بابا، وہ مجھے چائے میں ادرک ڈالنے، برش کے بجائے منہ میں لونگ رکھنے اور لکڑی کی ایک اسٹک سے دانت صاف کرنے، چمچ کے بغیر کھانا کھانے کا کہہ رہی تھیں۔ میں نے کہا دادی۔ آپ کے زمانے میں یہ کٹلری نہیں ہوتی تھی اس لیے نا۔ مگر وہ ناراض ہو گئیں۔" آمنہ کے لہجے میں سخت بے پروائی تھی۔

اب زاہد کے لیے شرمندگی کا موقع تھا کیونکہ وہ تو خود بھی ہاتھ کے بجائے کانٹے چمچ کا استعمال کرتا تھا۔ اور اس طرح کے ٹوٹکوں کا بچوں کے لیے استعمال نامناسب اور مشکل سمجھتا تھا۔ مسواک کے بجائے برش کو زیادہ مناسب سمجھتا تھا۔ یہ لمحہ زاہد کے لیے ایک اور یاددہانی تھی کہ چیزیں بلیک اینڈ وہائیٹ نہیں ہیں۔ بلکہ کچھ لو اور کچھ دو کا معاملہ بھی کرنا پڑے گا۔

سب سے بڑا مسئلہ جو زاہد کے دل کو کاٹ رہا تھا وہ "اردو" ان کی زبان۔ یہ ان کے بچوں کے لیے اجنبی ہوتی جا رہی تھی۔ علی اور آمنہ اکثر انگریزی میں بات کرتے تھے۔ زاہد جب اردو بولتا تو آمنہ مسکرا کر کہتی:

"بابا، آپ بہت مشکل زبان بولتے ہیں۔۔۔ ہمیں خدشہ ہے کہ آپ بھی رمیش سنگھ کے باپو کی طرح کسی دن ٹاول کو "شریر رگڑو" اور تھرمامیٹر کو "پخ میچو" کہنے کی ضد نہ کرنے لگیں۔"

اب زاہد بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اگر غالب و میر کی زبان وہ نہیں بول سکتا تو ان بچوں کو بھی وہ نستعلیق اردو درست شین کاف سے بولنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ انھیں ان الفاظ پر سمجھوتا کرنا پڑے گا جو عام استعمال میں رائج ہو چکے ہیں۔ البتہ بچوں کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھانے کے لیے اردو ادب کے مطالعے کی عادت انھیں ضرور ڈالنی ہو گی۔

یہ مسئلہ ایسا تھا کہ وہ سوچتا کہ زبان وہ رسی، وہ ڈوری ہے جو ایک نسل کو دوسری نسل سے جوڑتی ہے، باندھتی ہے لیکن اس کے کمزور ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس کے بچے اس ثقافت سے دور ہو رہے ہیں جس پر زاہد کو فخر تھا۔

زاہد نے فیصلہ کیا کہ وہ ان مسائل کو نظر انداز نہیں کرے گا۔ ایک شام اس نے سب کو ڈرائنگ روم میں بلایا۔

"بچو، مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دنیا مجھ سے مختلف ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ ہماری ثقافت، ہماری زبان، اور ہمارے تہوار ہمیں وہ شناخت دیتے ہیں جو ہمیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ ہم اپنی جڑوں کے بغیر ادھورے ہیں۔"

علی نے کہا: "لیکن بابا، یہ سب ہمارے دوستوں کو عجیب لگتا ہے۔"

زاہد مسکرایا: "ہاں، شاید وہ عجیب لگے۔ لیکن یاد رکھو، اگر تم اپنی پہچان کھو دو گے تو اپنی شناخت کو خطرے میں ڈال لو گے۔ تم اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے کہ اپنی ملکی قومیت تو بدل سکتے ہو لیکن رنگ اور نسل نہیں۔ تم کبھی ان کی شناخت میں اپنے آپ کو گم نہیں کر سکتے۔ تم ایک خاموش علیحدگی کا شکار رہو گے۔ جبکہ اپنی جڑوں سے جڑے رہنا تمھیں علیحدگی کے بجائے اپنی پہچان دے گا۔ اس سے تم احساسِ کم تری کا شکار نہیں ہو گے۔ یہ تمھیں اپنی مضبوطی کا احساس دلائے گا۔ تم مطمئن ہو گے ہماری تہذیب بھی خوب صورت ہے، اس کی زبان بھی بہت اعلیٰ روایات کی حامل ہے۔ اس کے فنون لطیفہ، اس کی موسیقی بھی قابل فخر ہے۔"

"بابا، ہمیں آپ کی یہ لوجک کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ دنیا ترقی کرتی ہے۔ اس کی تہذیب، اس کی زبان، اس کے خیالات۔۔۔ سب کچھ بدلتا ہے۔ مگر آپ ہیں کہ ہمیشہ ہمیں "نہ بدلنے" پر لیکچر دیتے رہتے ہیں۔"

زاہد صاحب کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ کچھ لمحے خاموش رہے۔ اپنی سوچوں کو اکٹھا کیا اور پھر بولے: "بھئی سوال تو تمھارا بہت اچھا ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اچھا تم یہ بتاؤ کہ کیا اگر تمہیں معلوم ہو کہ مجھ سے بھی اچھے ایک والد صاحب ہیں، وہ تمھارے خیالات اور نظریے کے زیادہ قریب ہیں، مجھ سے زیادہ شفیق، زیادہ مال دار اور زیادہ پڑھے لکھے ہیں، تو کیا تم چاہو گے تم مجھے چھوڑ کر اسے اپنا والد بنا لو؟"

کہانی

"یہ کیا سوال کیا بابا آپ نے؟ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ پوچھا بھی آپ نے کیوں؟"

صرف آمنہ ہی نے نہیں، علی نے بھی اس سوال پر بہت احتجاج کیا۔ ان کے لہجے میں محبت بھری شکایت تھی۔

تب زاہد صاحب بولے: "اچھا، تو چلو یہ بتاؤ کہ کونے میں جو بہت ہی خوب صورت گھر ہے اور جو آپ سب کو بہت پسند ہے، آپ چاہیں گے کہ آپ اپنا گھر چھوڑ کر اسے اپنا گھر بنالیں؟"

اس سوال پر وہ تھوڑا سا گڑبڑائے، آمنہ بولی: "یہ تو فضول بات ہو گی کہ ہم اس پر قبضہ جمالیں، اول تو وہ ہمیں قبضہ ہی کیوں کرنے دیں گے؟ اس لیے ہم وہی کریں گے جو ہم اکثر سوچتے ہیں۔۔۔ وہ یہ کہ اپنے گھر کو ویسا بنالیں، اس میں وہ خوبیاں اور تبدیلیاں کریں جو ہمیں اس خوب صورت گھر کی پسند ہیں۔"

زاہد صاحب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، وہ ایسا جواب ہی چاہتے تھے۔ فوراً بولے: "بس میرے بچو، میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تم اپنی تہذیب اپنا لباس، اپنی زبان نہ چھوڑو، بس اس میں وہ تبدیلیاں کر لو جو اس معاشرے میں رہنے کے لیے ضروری ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ تم پتلون کوٹ کے بجائے ململ کے پاجامے پہنو، تم کھُسّے اور ٹوپیاں پہنو، بائیں طرف کی ٹریفک کو اپناؤ، چمچ اور کانٹے کے بجائے ہاتھ سے ہی کھانا کھاؤ۔ کافی کے بجائے ٹھنڈی لسیاں پیو۔ تھرمامیٹر کے بجائے پنج میچو کہو۔۔۔ نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں تم کرسمس بھی مناؤ مگر اپنی عیدوں کو نہ بھولو، انگلش خوب بولو اور سیکھو مگر غالب، اقبال اور فیض کو بھی یاد رکھو۔ یہاں کے کھانے، مشروب اور لباس خوب پہنو مگر حلال حرام اور برہنگی اور پاکیزگی کا ضرور خیال رکھو۔ سوال ضرور کرو لیکن حفظ مراتب کا خیال رکھو۔ آزادی اور بے باکی ضرور اختیار کرو مگر اپنی حدود کو پہچان کر کرو۔ یہی ہماری تہذیب ہے۔۔۔ جیسا کہ اپنے مکان کو نہیں چھوڑنا چاہتے، اپنے باپ کو نہیں بدلنا چاہتے، اسی طرح اپنی جڑوں پر قائم رہتے ہوئے اپنے کلچر اور تہذیب کو بھی نہ چھوڑو۔"

انھوں نے بات مکمل کی تو بچوں کے چہرے بتا رہے تھے بات ان تک ایک حد تک پہنچ چکی ہے۔ علی بولا: "ٹھیک ہے بابا، بات تو سمجھ میں آتی ہے آپ کی۔۔۔ مگر کرنا کیا ہے۔؟"

اور اس کے بعد ان میں مزید گفتگو ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے ایک نئی روایت قائم کی۔ ہر ہفتے ایک دن ایسا رکھا گیا جب سب اردو بولتے، انگریزی کا لفظ بولنے والے کو اس لفظ کو دس دفعہ لکھنے کی "سزا" دی جاتی۔ ایسے دیسی کھانے کھاتے جس کی بچے فرمایش کرتے۔ اور اپنی ثقافت کے بارے میں گفتگو کرتے، اچھا سوال پوچھنے پر پچاس ڈالر کا انعام تھا اور کوئی بھی سوال نہ پوچھنے والے کو اقبال یا غالب کا ایک شعر یاد کرنے کو کہا جاتا۔ مہینے میں وہ

اپنے ان دوستوں کو اکٹھا کرتے جو، ان کے ہم وطن اور ہم خیال ہوتے۔ ون ڈش پارٹی کرتے، آؤٹنگ کرتے۔ باہمی دلچسپی کے کھیل کھیلتے۔ آن لائن اچھے اہل علم لوگوں سے سوال وجواب کی مجالس منعقد کرتے۔

ایک گھنٹا زاہدا نہیں اردو کے ادیبوں کی دل چسپ کہانیاں سناتے، اپنے پسند کے گانے سنواتے، اور تہواروں کی روح کو سمجھاتے۔ یہ آسان نہیں تھا، لیکن آمنہ اور علی نے آہستہ آہستہ دلچسپی لینا شروع کی۔ ان کے لیے غالب و اقبال، فیض و فراز، یوسفی و غامدی، اشفاق و بانو، بیدی و منٹو اور عمیرہ و نمرہ وغیرہ اجنبی نہیں رہ گئے تھے۔

یہ ایک مسلسل جدوجہد تھی، لیکن زاہد جانتا تھا کہ یہ کوشش ضروری ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ یہ جنگ ہار گیا، تو وہ اپنی نسل کو کھو دے گا۔ یہ صرف اس کے بچوں کا مسئلہ نہیں تھا، یہ ہر اس خاندان کی کہانی اور جدوجہد ہے جو اپنی ثقافت کو ایک نئی دنیا میں محفوظ رکھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

علی عباس

بپسی سدھوا: لاہوری مصنفہ

لاہور سے بے پناہ محبت رکھنے والی عالمی شہرت یافتہ پاکستانی پنجابی پارسی مصنفہ اور اُستاد "بپسی سدھُوا" امریکہ میں انتقال کر گئیں۔ یہ مضمون ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے شامل اشاعت کیا گیا ہے

بپسی سدھوا اب ہم میں نہیں رہیں، اُن کو ایک ایسی مصنفہ کے طور پر یاد رکھا جائے گا جنھوں نے برصغیر میں انگریزی ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا اور اُن کے ناولوں پر نہ صرف بالی وڈ میں فلمیں بنائی گئیں بلکہ ان کے ناول امریکہ کے کئی تعلیمی اداروں کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بپسی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ایک اینگلو انڈین خاتون سے حاصل کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو اڑھائی برس کی عمر میں پولیو ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے کہنے پر والدین نے انھیں سکول داخل نہیں کروایا۔ وہ شکر ادا کیا کرتی تھیں کہ اُن کو بچپن میں ریاضی کا مضمون نہیں پڑھنا پڑھا۔

کچھ بڑی ہوئیں تو بھائی کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگیں۔ انھی دنوں کتابیں پڑھنے کا شوق پروان چڑھا اور پہلا ناول 'لِٹل وومن' پڑھا۔ بپسی نے اس بارے میں مصنف سے ایک تفصیلی انٹرویو میں بات کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ ناول پڑھا تو میرے لیے نئی دنیا کے در وا ہو گئے۔ مجھ پر منکشف ہوا کہ دنیا میں مختلف کردار ہیں جن کے جذبات اور تعلقات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چنانچہ میں نے کتابوں میں پناہ لی جنھوں نے مجھے زیست کے نئے رنگوں سے متعارف کروایا۔ میں مطالعہ کی عادت کے باعث خیالی دنیا میں زندہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک مصنفہ بننے میں کامیاب ہو سکی۔"

کچھ عرصہ بعد لاہور کے کنیئرڈ کالج میں داخلہ لیا۔ اس دوران میں ان کی شادی ہو گئی تو ممبئی چلی گئیں۔ اُن کا گھر ایک ایسی آبادی میں تھا جہاں پارسیوں کی بڑی تعداد بستی تھی۔ اُنھوں نے اُس دور میں بیتے تجربات کی بنیاد پر اپنا ناول 'کرو ایٹرز' لکھا جس کا بعد میں 'جنگل والا صاحب' کے عنوان سے اُردو میں ترجمہ بھی ہوا۔

بپسی سدھوا اُس وقت آٹھ، نو برس کی تھیں جب تقسیم ہوئی جس کی یادیں ہمیشہ اُن کے ساتھ رہیں۔ اس دور کے بارے میں انھوں نے بتایا:

"فضا میں مختلف نعرے گونجتے رہتے۔ ساری قومیں اپنے اپنے نعرے لگا رہی ہوتیں۔ سکھ 'سَت سری اکال'، ہندو 'ہرے رام' اور مسلمان 'اللہ اکبر' کی صدائیں بلند کر رہے ہوتے۔ میرا تاثر یہ تھا کہ نعرے لگانے والے اچھا کام نہیں کر رہے تھے۔"

انھوں نے مزید کہا تھا کہ تقسیم نے میرے ذہن پر گہرا عکس چھوڑا۔ پڑوس میں ایک سردار جی رہتے تھے جن کے بچے میرے دوست تھے اور میں اُن کے ساتھ بہت زیادہ کھیلا کرتی تھی۔ وہ تقسیم کے بعد ہندوستان چلے گئے جس کے باعث میری تنہائی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اِن دنوں کا ہی ذکر ہے کہ ایک روز بلوائی نعرے لگاتے ہوئے اُن کے گھر آ گئے تو گھر کے خانساماں امام دین باہر آئے اور بلوائیوں سے کہا کہ 'بیوقوفو، یہ پارسی خاندان ہے اور ضروری نہیں کہ بھنڈارا ہندو ہی ہوں۔' یوں، بلوائی اُن کے گھر سے چلے گئے۔

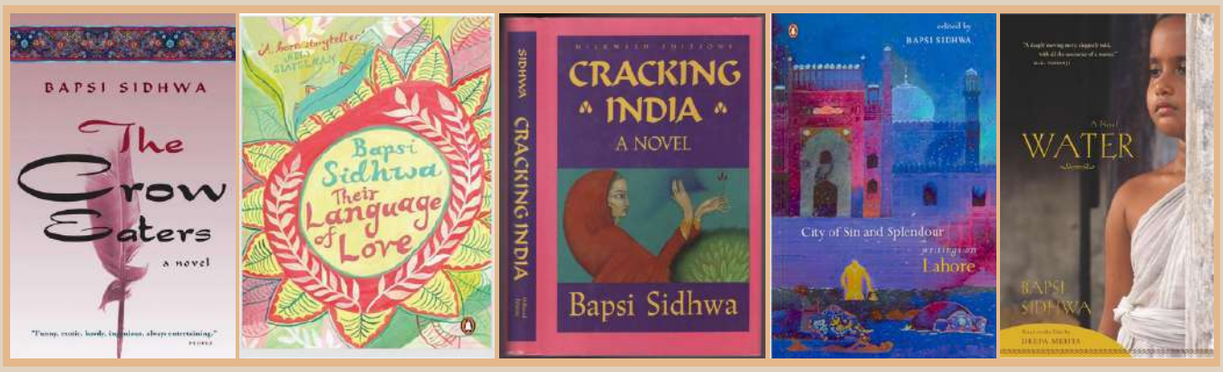

بپسی کبھی یہ واقعہ فراموش نہ کر سکیں جو اُن کے ناول 'کریکنگ انڈیا' کی تخلیق کی وجہ بھی بنا جس پر کینیڈین نژاد انڈین فلم میکر "دیپا مہتا" نے فلم 'ارتھ 1947' بنائی تھی جس میں عامر خان اور نندیتا داس نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بپسی کا خاندان ڈین ریاست گجرات سے تھا مگر اُن کا بچپن لاہور میں گزرا اور انھوں نے ذریعۂ اظہار انگریزی کو بنایا۔ اس بارے میں بپسی نے کہا تھا کہ 'یہ درست ہے کہ میں نے انگریزی میں لکھا لیکن ایک بار پنجابی کے ایک بہت بڑے نقاد نے کہا تھا کہ پنجابی زبان کی اصل مصنفہ تو بپسی ہیں جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میری تحریروں میں اُردو اور پنجابی محاوروں کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ میرے ارد گرد گجراتی بولنے والے زیادہ لوگ نہیں تھے جس کے باعث میرا زیادہ واسطہ اُردو اور پنجابی بولنے والوں سے پڑتا لیکن میں چوں کہ بچپن سے انگریزی لکھتی اور پڑھتی رہی ہوں تو اس لیے انگریزی زبان کو ہی ذریعۂ اظہار بنایا۔'

آگے بڑھنے سے قبل یہ بتاتے چلیں کہ بپسی نے اپنے ناول "آئس کینڈی مین" کا عنوان تبدیل کر کے 'کریکنگ انڈیا' رکھ دیا تھا جو اسی نام سے شائع ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ امریکا میں منشیات استعمال کرنے والوں کے لیے 'آئس کینڈی مین' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس سے پڑھنے والے یہ گمان لگا سکتے تھے کہ یہ منشیات کے موضوع پر لکھی گئی کوئی کتاب ہے۔

"'کریکنگ انڈیا' بپسی کے اُن ناولوں میں سے ایک ہے جو بہت سی امریکی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس ناول میں تقسیم کے پس منظر میں عورتوں پر ہونے والے ظلم کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بپسی نے اس بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'تقسیم کے وقت عورتوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ عزت کا مسئلہ تھا۔ اس لیے اس موضوع پر زیادہ نہیں لکھا گیا جب کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ اُردو میں منٹو نے بہت اچھا لکھا ہے۔ فلم 'گرم ہوا' سال میں ایک مرتبہ ضرور ہوں۔ اس کی کہانی عصمت چغتائی نے لکھی ہے جن کی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی ہیں اور مجھے اُن کا اندازِ تحریر بہت پسند ہے۔"

یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بپسی کی ابتدائی زندگی کے تجربے غیر معمولی نوعیت کے نہیں تھے، وہ تو اپنی ذات میں مقیّد رہی تھیں۔ ایسے میں وہ کیا تجربات تھے جنھوں نے بپسی کو لکھنے کی جانب متوجہ کیا؟ اس سوال کے جواب میں بپسی کا کہنا تھا کہ 'میری ممبئی میں جب پہلی شادی ہوئی تھی تو میرے شوہر کہا کرتے تھے کہ تمھیں نہ چلنا آتا ہے، نہ ہی بولنا آتا ہے۔ تم کیا ہو؟ میں اس قدر عجیب زندگی گزار رہی تھی۔ جب میں نے لکھنا شروع کیا اور میری کتاب شائع ہو گئی تو میرے اعتماد میں اضافہ ہوا کہ میں تو بول سکتی ہوں۔ بعد ازاں دنیا کا بہت زیادہ تجربہ ہوا جو اس وقت نہیں تھا۔

بعد ازاں جب بپسی امریکہ گئیں تو انھیں ایک یونیورسٹی کی جانب سے تدریس کی پیشکش کی گئی۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ میں نے تو پی ایچ ڈی نہیں کی اور صرف بی اے پاس ہوں۔ اُس وقت تک اُن کی دو کتابیں شائع ہو چکی

تھیں۔ یونیورسٹی کی جانب سے ان کی اِن کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ آپ نے کئی پی ایچ ڈیز کر لی ہیں اور آپ تدریس کی ذمہ داری انجام دینے کے لیے اہل ہیں۔

بپسی کے ناول 'دی برائیڈ' میں بھی عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ناول 'دی امریکن براٹ' بھی کچھ ایسی نفسیاتی الجھنوں کا احاطہ کرتا ہے جس کے مرکزی کردار "فیروزہ" کو اُس کے والدین اس لیے امریکی یونیورسٹی میں داخل کراتے ہیں تاکہ وہ انتہا پسندی سے دور رہے مگر جب وہ پسند کی شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے تو وہ اُس کے اس فیصلے کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اس ناول کے بارے میں بپسی نے کہا تھا کہ اِس میں اُن کی ذاتی زندگی کی جھلک ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ 'میں اُس وقت لاہور میں تھی جب مجھے میری بیٹی کا خط موصول ہوا جس میں اُس نے ایک امریکی سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں اس خبر پر خوب روئی، بیٹی۔ شوہر کو فون کیا، وہ بھاگ کر آئے۔ اُن کو بھی یہ سن کر بہت صدمہ پہنچا۔ اس ناول میں بھی ماحول کی تبدیلی کے بعد میری بچیوں اور میرے ساتھ میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا بیان ہے جنھیں میں نے تخلیقی انداز میں پیش کیا ہے۔

'کروایٹرز' بپسی کے چند اہم ناولوں میں سے ایک ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے جب یہ ناول خود شائع کروایا تو ناقدین اور صحافیوں نے کہا کہ یہ غیر معیاری ناول ہے اور اسے سرے سے ہی رَد کر دیا۔ اُن دنوں ہی لندن کے معروف ادبی اشاعتی ادارے نے یہ ناول شائع کیا تو اس وقت اسے نہ صرف سراہا گیا بلکہ ہر اخبار اور جریدے نے اس پر مثبت ریویو لکھے۔

بپسی سدھوا کا ایک اہم حوالہ اُن کا لاہوری ہونا بھی ہے جس کا قرض ادا کرنے کے لیے انہوں نے کتاب 'The City of Sin and Splendor' مرتب کی جس کے باعث یہ سوال پیدا ہونا فطری ہے کہ انھوں نے لاہور کے بجائے امریکا میں رہنے کو کیوں ترجیح دی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ 'میرے شوہر کو امریکہ میں رہنے کا بہت شوق تھا۔ دوسرا نوجوانی ہی میں امریکا جانا شروع کر دیا تھا کیوں کہ میرے شوہر وہاں رہتے تھے۔ حقیقت مگر یہ ہے کہ میرا تمام تر شعوری ارتقا لاہور میں ہی ہوا۔

انھوں نے اس کتاب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'میں نے اس کتاب کو مکمل کرنے میں تین برس لگائے۔ اس دوران میں شاید دو ناول لکھ سکتی تھی۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مجھے ہر صورت میں لاہور پر کتاب لکھنی ہے کیوں کہ انگریزی زبان میں لاہور پر زیادہ کام نہیں ہوا۔ یہ ایک طرح سے اس شہرِ بے مثل سے محبت کا اظہار ہے۔'

بپسی سدھوا نے خود کو صرف ناول لکھنے تک محدود نہیں کیا بلکہ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور مختلف جرائد کے لیے وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتی رہیں۔ اُن کا افسانوی مجموعہ 'دیر لینگویج آف لوَو' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

بپسی کا کہنا تھا کہ 'یہ سلسلہ اتفاقیہ طور پر شروع ہو گیا۔ میں لندن میں تھی تو ایک ادبی جریدے کے مدیر نے مجھ

سے افسانہ لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے اُن کی اِس درخواست پر عمل کر دیا۔ 'دی امریکن براٹ' بھی پہلے شارٹ سٹوری ہی تھی جو شائع ہو چکی تھی جس کے بعد کچھ اور افسانے بھی لکھے تو وہ اس مجموعے میں شامل ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دیپا مہتا کی فلم 'واٹر' پر بعد ازاں بپسی نے اسی نام سے ناول لکھا۔ یہ ایک منفرد تجربہ تھا جب کسی فلم کی کہانی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ناول لکھا گیا کیوں کہ عموماً ناولوں پر فلمیں بنائی جاتی ہیں۔

بپسی کا کہنا تھا کہ 'دیپا کی یہ شرط تھی کہ میں یہ ناول تین ماہ میں مکمل کروں تاکہ یہ فلم کے ساتھ ہی ریلیز ہو۔ اس نے مجھے کچھ کتابیں بھی ارسال کیں۔ میں نے یہ فلم قریباً سو بار دیکھی ہو گی اور یہ ناول لکھنے کے لیے دن رات ایک کر دیا کیوں کہ یہ کہانی میرے شعور کا حصہ نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں نے یہ ناول چار ماہ میں مکمل کر لیا اور اُس وقت زیادہ حیرت ہوئی جب ناقدین نے یہ کہا کہ پہلی بار کسی فلم پر اس قدر شاندار ناول لکھا گیا ہے۔

بپسی سدھوا کے ناولوں میں پدر شاہی سماج میں بسنے والی بے بس عورتوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہے، وہ کہانیاں جو ہم روز اپنے ارد گرد رونما ہوتے دیکھتے ہیں مگر خاموش رہتے ہیں کیوں کہ ہم خوف زدہ ہوتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ ہم بھی آخر اسی سماج کا حصہ ہیں۔ 'پاکستانی پنجابی پارسی' کے طور پر اپنا تعارف کروانے والی بپسی نے بے خوف ہو کر وہ لکھا جو انھوں نے محسوس کیا۔

برصغیر میں انگریزی ادب کو نئی رفعتوں سے متعارف کروانے والی یہ مصنفہ گزشتہ دنوں امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن میں چل بسیں۔ اُن کی عمر 86 برس تھی۔ بپسی کا بچپن لاہور کی وارث روڈ پر گزرا تھا، وہ بہت عرصہ لاہور کینٹ میں بھی رہیں۔

علیزے نجف

خود مختاری: مرد وزن کا مشترکہ حق

خود مختاری اور آزادی کے الفاظ اپنے اندر ایک طوفان لیے ہوئے ہیں۔ان کے کیا حدود ہیں ؟اور ان کا تعلق صرف عورتوں ہی سے ہے یا اس کے مخاطب مرد بھی ہیں ؟ایک اہم موضوع کی بہت ضروری تفہیم !

فطرت کی طرف سے انسان کو ملنے والی نعمتوں میں سب سے ممتاز نعمت اس کا اختیار اور ارادہ ہے۔یہی وہ نعمت ہے جو اس کائنات میں پیدا ہونے والی کشمکش کی بنیادی وجہ ہے اور یہی اس کے روز افزوں ترقی کا زینہ بھی۔ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو ملنے والا اختیار اور ارادہ اس کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہے اور وسیلۂ کامیابی بھی۔وہ اپنے ہر عمل میں مکمل طور سے آزاد ہے۔اس کائنات کے نظام کو چلانے کے لئے فطرت نے کچھ اصول بھی بنا رکھے ہیں جس کے تحت بعض اوقات سرکشی پہ مائل اختیارات پر بند باندھ دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان کو مہلت ملتی رہتی ہے۔

خیال رہے کہ یہاں لفظ انسان کے ذکر کو فقط مردوں سے منسوب نہیں کیا گیا بلکہ اس میں مرد اور عورت دونوں ہی شامل ہیں۔ایسے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں کو ملنے والی خود مختاری سے محروم کرنے کی کوشش کیوں کی جاتی ہے ؟کیا اس دنیا میں فقط مرد ہی حالتِ امتحان میں ہیں ؟نہیں نا... تو پھر کیا وجہ ہے کہ عورتوں کو آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اپنے بنیادی حقوق اور خود مختاری کے لئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔عورتوں کی

نقطہ نظر

آزادی چھین کر مرد خود اپنے لئے بھی آزمائش میں اضافہ کر رہے ہیں کیوں کہ جب عورتیں شعور اور بدلتے زمانے کے تقاضوں سے نابلد ہوں گی تو ان کے ذریعے سے تشکیل پانے والا ماحول کیسے ترقی یافتہ ہو سکتا ہے؟

اس کے علاوہ خود عورتوں کو جو مشکل ہو رہی ہے وہ تو ہے ہی، ہمیشہ سے ہی روایتیں اور کسی خاص صورتِ حال میں اپنائی گئی احتیاطی تدابیر عورتوں کے حقوق اور اختیار کو محدود کرنے کی بنیادی وجہ رہی ہیں۔ بدلتے وقت نے بے شک اس حوالے سے بہت کچھ تبدیل کر دیا ہے اب حالات پہلے سے خاصے بہتر ہو چکے ہیں۔ لیکن اب بھی کئی ایسے شعبہ جات اور علاقے ہیں جہاں عورتوں کو غیر معمولی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ کچھ قبائلی علاقوں میں ان کی مرضی، رائے اور حق خودارادیت کو آج بھی بے دردی سے روند دیا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف بعض جگہوں پہ آزادی کے نام پر بے حیائی اور سرکشی کی وکالت کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں ہی انتہا پسندی پر مبنی صورتِ حال ہے۔ مسلم طبقات میں بھی عورتوں کی آزادی اور حقوقِ نسواں کے حوالے سے تنگ نظری پائی جا رہی ہے۔

اسلام نے عورتوں کو کیا حقوق دیے اور مسلمان ان حقوق کی ادائیگی میں کتنے مستعد ہیں، یہ دو الگ الگ موضوع ہیں۔ شہری زندگی میں گزرتے وقت کے ساتھ کسی حد تک عورتوں کی آزادی کی کھڑکیاں اور دروازے وا ہوتے جا رہے ہیں لیکن دیہی علاقوں کی مسلم خواتین کی اکثریت اب بھی اپنی ذاتی زندگی کے فیصلوں میں مردوں کے تابع ہیں۔ کہیں پہ مرد کی انا اور اختیار آڑے آ رہا ہے تو کہیں پر خاندانی اور معاشرتی روایتیں آج بھی عورتوں کے پیروں میں بیڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایسے خاندانوں کے مردوں کی اپنی توجیہات ہیں۔ ان میں سب سے عمومی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی بچیوں کی عزت و آبرو کے تحفظ کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ لڑکیاں جب بھی اپنے پر کھول کر پرواز کرنے کی کوشش کرتی ہیں تو انھیں یہ کہہ کر باندھ دیا جاتا ہے کہ جب شادی ہو جائے تو جو دل کرے کرتی رہنا۔ دوسری طرف جب وہ سسرال میں قدم رکھتی ہیں تو سب سے پہلے ان کے پروں کو یہ کہہ کر کاٹ دیا جاتا ہے کہ یہ تمھارے ماں باپ کا گھر نہیں جو من مرضیاں کرتی پھرو گی۔ یہاں تمھیں ہمارے حساب سے رہنا ہو گا۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر کب ان کی مرضی اور اختیارات کو اس پدرسری معاشرے میں مسلّمہ مقام حاصل ہو گا۔ عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم کی اپنی ایک طویل تاریخ ہے، دوسری اقوام نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اور عورتوں کو انسان ہونے کا مارجن دیتے ہوئے آزادیِ نسواں کے لیے عورتوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر خود بھی کوشش کرنی شروع کر دی ہیں۔ بے شک کچھ واقعات اس سے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں لیکن ہم مجموعی طور پہ ہونے والی کوششوں کو نظرانداز نہیں کر سکتے جس کے نتائج آنے والے وقت میں وقوع پذیر یوں گے۔ دین اسلام جو کہ انسان کے حقوق کا ہمیشہ سے علمبردار رہا ہے اب ضروری ہے کہ اسلام کا دم بھرنے والے مسلمان بھی معاشرتی

نقطہ نظر

تنگ نظری سے باہر نکل کر اس تبدیلی کو قبول کر لیں جو کہ واقع ہو کر رہے گی۔ ڈجیٹل دنیا نے ایک ایسے انقلاب کی راہ ہموار کر دی ہے جس کا دائرہ گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا، عورتوں کو اب چہار دیواری میں بند کرنا انتہائی مشکل ہے کیوں کہ ایک چھوٹی سی اسکرین اسے پوری دنیا سے باآسانی متعارف کرا رہی ہے۔ اس ڈجیٹل دنیا میں وہ سارے عوامل بھی موجود ہیں جو انقلاب یا بغاوت کو ہوا دے سکتے ہیں۔ ایسے میں اب اس کے شعوری فکر پر قدغن لگانا ایک امر محال ہو گا۔

مسلم خاندانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کی شرح پہلے سے بہت بہتر ہوئی ہے لیکن اعلی تعلیم کے معاملے میں اب بھی بہت پیچھے ہے۔ دیہی علاقوں کے مرد یہ کہہ کر لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں کہ ماحول بہت خراب ہو چکا ہے۔ اسکرین لڑکیوں کے اندر بے راہ روی کو فروغ دے رہی ہے۔ اس لئے بنیادی تعلیم کا حصول ہی کافی ہے ۔میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ آج سے بیس تیس سال پہلے جب اس قدر معاشرتی برائیاں نہیں تھیں، اخلاقی اقدار خاصی بہتر تھے پھر اس وقت لڑکیوں کو کیوں نہیں پڑھایا؟ کیوں انھیں فقط گھروں تک محدود رکھا۔ یہ اندیشے حقیقتاً محض ایک راہِ فرار ہے۔ ہر دور کے اپنے چیلنجز ہوتے ہیں، ان کا سامنا کر کے آگے بڑھنا وقت کا تقاضا ہوتا ہے۔ کبوتر کی طرح آنکھیں موند کر خطرے کو جھٹلایا جا سکتا ہے لیکن اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ زمانہ اپنی رفتار کے ساتھ اپنی ہی رو میں چلتا رہے گا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ چیلنجز کا سامنا کرتے ہوئے سربلندی حاصل کرتے ہیں یا پھر بزدلوں کی طرح خود پیچھے رہتے ہیں۔ اس طرح کی کوششیں کرنے کے بعد جب احساس ہو کہ زمانہ آگے نکل گیا اور ہم پیچھے رہ گئے تو احساسِ مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں کی توجہ اور خیرات کے ساتھ جینے کے لئے واویلا کرنے سے حالات بدلتے ہیں اور نہ ہی مستقبل۔

اس وقت بات عورتوں کو اس پہلو سے بااختیار بنانے کی ہو رہی ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو بہتر طرز پہ گزار سکیں۔ خود نظریات و خیالات کی تشکیل کرتے ہوئے اچھے اور صحت مند ماحول و معاشرہ کی تشکیل کر سکیں۔ گھروں کے نظام میں در آنے والی انارکیت نے نسلوں کے مستقبل کو داؤ پہ لگا دیا ہے۔ اس کی وجہ عورت اور مرد کے درمیان متوازن ہم آہنگی کا نہ ہونا ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں بیسویں صدی کی مہارتوں کو چھوڑ کر نئی لائف اسکلز سیکھنے کی ضرورت ہے جس میں مرد کو اپنی بے بنیاد انانیت اور عورت کو بے جا جذباتیت کے دائرے سے باہر نکلنا ہو گا۔ مرد اور عورت کے درمیان ذاتی خود مختاری کا واضح ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ مشترکہ ذمے داریوں کے حوالے سے بات چیت کر کے اصولوں کو واضح کرنا از حد ضروری ہو چکا ہے تاکہ ہمہ وقت کشاکش پیدا کرنے والی صورتِ حال سے بچا جا سکے۔

نقطہ نظر

عورتوں کے خود مختار ہونے سے متعلق بات کرتے ہوئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ عورتوں کے خود مختار ہونے کا مطلب کیا ہے؟ خود مختار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو بے جان اشیاء کی طرح اپنے حکموں کا پابند نہیں کیا جانا چاہئے اور نہ ہی ان سے غیر مہذب سلوک روا رکھا جانا چاہئے، وہ اپنی زندگی کے مقصد کے تعین میں آزادی کا استحقاق رکھتی ہیں۔ ان کے بنیادی حقوق کو سلب کر کے ان کے رد عمل پہ کسی طرح کی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مردوں کی طرح انسان ہونے کی حیثیت سے سارے حقوق و اختیار رکھتی ہیں۔ بے شک دونوں کے بنیادی دائرہِ کار الگ ہو سکتے ہیں لیکن اس سے ان کی ذاتی زندگی اور اس کے تحت فیصلے کرنے کے اختیار پہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی۔ مثلاً ایک عورت بحیثیت ماں گھر پہ بچوں کو اچھی تربیت اور اچھا ماحول دینے کی پابند ہے لیکن اسے محض اس وجہ سے گھر میں قید نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک ماں ہے۔ وہ ایک ماں ہوتے ہوئے انسان بھی ہے اس مارجن کو ہم کبھی بھی ختم نہیں کر سکتے۔ اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاشی طور خود کو محفوظ رکھ سکے۔ اس کا طریقہِ کار ہر عورت اپنے حساب سے متعین کر سکتی ہے کیوں کہ ہر کسی کی زندگی اور حالات دوسروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بے شک عورت پہ بھی یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مرد کے ظلم و زیادتی سے بچنے کی کوشش کرتے کرتے خود ان پہ ظلم نہ کرنے لگ جائے۔ ان کی عزت نفس کو چیلنج کر کے اپنا حق حاصل کرنے کے بجائے مہذب طریقے سے بات چیت کر کے اس کے حصول کی راہ ہموار کرے۔

میں نے پہلے کہا تھا کہ انسان کو ملنے والی سب سے بڑی نعمت اس کا اختیار وارادہ ہے جو کہ اس کی آزمائش کی وجہ بھی ہے۔ عورت کو بھی قدرت نے بحیثیت انسان کے اختیارات دیے ہوئے ہیں۔ ایسے میں اختیارات کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے سے جڑے رشتوں کو پامال کر کے کچھ بھی کر گزرے۔ خود مختار آپ اپنی ذاتی زندگی میں ہیں لیکن فرائض اور ذمے داریوں میں نہیں۔ اس لئے بحیثیت ماں، بہن، بیٹی اپنے فرائض کو ادا کرنے کی ہر عورت پابند ہے۔

اس جدید یافتہ دور میں بے شک عورتوں کو پہلے کے مقابلے میں بہت حد تک آزادی حاصل ہو گئی ہے لیکن ان کا تحفظ آج بھی ایک سوالیہ نشان ہے۔ پڑھے لکھے خاندانوں میں اپنے گھر کی عورتوں کو فرسودہ روایات کا پابند بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ان کی خاندانی شرافت و نجابت بیرونی دنیا کی غلاظت سے محفوظ رہ سکے۔ اس مشکل سے نمٹنے کے لئے پابندیوں کو مسلط کرنے کے بجائے انھیں حکمتِ عملی بنانے کی ضرورت ہے جس میں سب سے اہم یہ ہونا چاہئے کہ خود اپنے گھر کے لڑکوں اور مردوں کو ان حدود کا پابند بنایا جائے جس سے دوسرے گھروں کی عورتیں ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ اگر یہ کام ہر عورت کرنے لگ جائے تو معاشرے کی یہ بگڑتی تصویر خاصی حد تک

بہتر ہو سکتی ہے۔ بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگی کرنے کی تگ و دو میں اکثر والدین اپنی بچیوں کو آزادی تو دے دیتے ہیں لیکن وہ ہمہ وقت ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف دنیا کے تقاضوں کے مطابق لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان تفریق بدترین نتائج پیدا کر سکتی ہے تو دوسری طرف یہ ڈر کہ اس مادر پدر آزاد معاشرے میں لڑکیوں کی حفاظت کیسے ممکن ہے؟

جیسا کہ پہلے ہی میں نے کہا کہ تعلیم لڑکیوں کی بنیادی ضرورتوں میں شامل ہے جو کہ ماں باپ تسلیم کر چکے ہیں لیکن اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے پائی جانے والی بیداری ابھی بھی تسلی بخش نہیں۔ اس پہلو پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھیں آزادی کے ساتھ زمانے کے حقائق اور مذہب کی تعلیمات سے روشناس کرانا نہ بھولیں کیوں کہ اب وہ دور نہیں رہا کہ پابندیوں کے ذریعے کسی کی سوچ اور خیالات کو ایک حد کا پابند بنایا جا سکے۔ اس لئے بہتر ہے کہ حقیقت کا سامنا کرتے ہوئے مشکلات سے بچنے کی تدبیر پیدا کی جائے۔ لڑکیوں کو خود مختار بنانے کے لئے جس قدر اعلیٰ تعلیم ضروری ہے، اسی قدر یہ بھی ضروری ہے کہ کیریئر کا انتخاب کرتے ہوئے ان کی مرضی کا بھی دھیان رکھا جائے۔ اپنی خواہش تھوپ کر انھیں کنٹرول کرنے کی کوشش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر یہ لگتا ہے کہ وہ نادانی میں غلط فیصلہ لے رہی ہیں تو انھیں غیظ و غضب سے روکنے کے بجائے ان کو عقلی طور پہ قائل کرنے کی کوشش کریں۔ انتہائی ناگزیر صورتِ حال ہی میں ان پر اختیارات کا استعمال کرنا چاہیے۔

یہ دورِ جمہوریت ہے۔ جمہوری مزاج جب تک انسانوں کے اندر نہیں پیدا ہوگا، وہ معاشرے میں کبھی بھی اپنے مثبت اثر مرتب نہیں کر سکے گا۔ عورتوں کی خود مختاری کے ذریعے سے معاشرے میں کئی طرح کی تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ مردوں کو ان کے ساتھ کام کر کے معاشرہ اور ماحول، دونوں کو ہی از سر نو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں مرد اور عورت مل کر اس میں موجود امکانات وسائل و مسائل کو مثبت رخ دے کر معاشرے کی تعمیر کر سکتے ہیں۔

محمد وقاص رشید

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ کی بازگشت

جب رسولِ خدا تھے آئے یہاں
بن کے رحمت برائے دونوں جہاں

جاہلانہ وہ اک روایت تھی
جس میں وحشت و بربریت تھی

بیٹیوں کو وہ وار دیتے تھے
جیتے جی ان کو مار دیتے تھے

بیٹی کہتی تھی میرا کیا ہے قصور
باپ کہتا تھا لے کے دل میں فتور

میری غیرت کو یہ گوارہ نہیں
میرے گھر میں تیرا گزارہ نہیں

کل کوئی تجھ کو لے کے جائے گا
ہاتھ میرے نہ کچھ بھی آئے گا

خرچ تجھ پر کروں میں کس خاطر
مارتا ہوں تجھے میں اس خاطر

بیٹی چلاتی اور روتی تھی
زندہ در گور ہائے ہوتی تھی

پھر رسولِ خدا نے حکم دیا
جو بیٹی کو پالے پوسے گا

اپنے رب کی رضا وہ پائے گا
اس کی جنت میں سیدھا جائے گا

زندگی کے سو پھول کھلنے لگے
بیٹیوں کو حقوق ملنے لگے

ہائے افسوس یہ کہوں کیسے
اس پہ خاموش بھی رہوں کیسے

کتنا سفاک بن گیا یہ سماج
ان کی امت کی ننھی بیٹیاں آج

پھر سے بچپن میں ماری جانے لگیں
اسی غیرت پہ واری جانے لگیں

کہیں کاری کہیں سوارہ، ونی
کہیں خوں کا فقط کفارہ بنی

یاں تلک کہ وہ جب نو بالغ ہوں
ہائے معصومیت کی مالک ہوں

آج دل میں لیے وہ ایک ملال
پوچھتی ہیں فقط خدا سے سوال

تیرے دین کے مبلغین یہاں
کس کا کرتے ہیں دین بیاں

یہ تو وہ منبرِ رسالت تھا
یہ تو وہ دو جہاں کی رحمت تھا

جس سے بچپن تھا پایا بچیوں نے
جس سے جیون تھا پایا بچیوں نے

سخن وری

سچ بتاتے نہیں یہ لوگوں کو
زندہ در گور کرتے بچیوں کو

ننھی عمروں میں یوں نکاح کر کے
انکا جیون ہی یوں تباہ کر کے

ہم سے جیون ہمارا لیتے ہیں
ظالمانہ یہ فتوے دیتے ہیں

سورہ تکویر کی وہ آیت ہے
جس میں وہ منظرِ قیامت ہے

جب خدا ہم سے یہ کرے گا سوال
ہم بھی اٹھیں گی دل میں لے کے ملال

کس نے زندہ ہمیں ہے دفنایا
کس نے بچپن ہمارا سہایا

اس نو عمری میں سرخ جوڑا نہیں
در حقیقت ہے کفن پہنایا

" بای زنب قتلت " کی
گونج سارے جہاں میں ہو گی جدا

جب عدالت لگے گی اس رب کی
اور انصاف وہ کرے گا خدا

ثوبیہ نورین

اُلّو برائے فروخت نہیں

پروڈکشن: مومنہ درید

نشر: ہم ٹی وی

مرکزی اداکار: نعمان اعجاز، صبا قمر، ارسہ غزل، یُمنیٰ زیدی

ایوراڈز: لکس اسٹائل ایوارڈ برائے مصنف آمنی مفتی اور اداکار نعمان اعجاز

ڈرامے پر تبصرہ

ڈرامہ، "الو برائے فروخت نہیں" اگرچہ قارئین کی خاطر خواہ توجہ حاصل نہ کر سکا لیکن میری نظر میں، آمنہ مفتی کے قلم سے ایک شاہکار ڈرامہ ہے جو معاشرے کے کچھ خاص طبقات اور ان کے سنگین مسائل کی حقیقت کھولتا ہے۔ وہ چودھری سسٹم، جہاں زمین کی ملکیت ایک مرد کی شان ہے، اور اس کی بقا کی آخری امید۔ اس شان میں زمین کا چپہ کم کرنا بھی زندگی بلکہ زندگیوں کا مسئلہ کھڑا کر دیتا ہے۔ نئی نویلی دلہن کو قبر میں اتارنا پڑے یا کسی اور معصوم کی جان لینے کے لیے کئی بار، زہر کو لسّی میں گھولنا پڑے، کچھ مسئلہ نہیں۔

یہ ڈرامہ بتاتا ہے کہ کس طرح ذات پات کے تصورات سے آلودہ اذہان، انسانوں کے تمام فیصلوں کو متاثر کرتے ہیں۔ کئی پہلوؤں سے یہ ڈرامہ ایک بے مثال ڈرامہ ہے، جس میں فہم کو شعور دینے والے ڈائلاگز، سامعین کی دلچسپی کو برقرار رکھنے اور ذہن کو گرفت میں لیے رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ڈرامہ تمثیلی اسلوب سے بھرپور ہے، مگر آرٹ تو وہی ہوتا ہے جو تخیل کو وسعتِ پرواز دے۔ ہر قسط ہی اس پہلو کو سموئے ہوئے ہے۔ یہ ڈرامہ جن محاسن کا، احاطہ کیے ہوئے ہے، اس میں، انسانی ہوس کی بے لاگ داستانوں کے علاوہ کرداروں غلام فرید، گلِ رعنا، آسیہ، سرچوہان، چودھری یعقوب ملکانہ اور میاں اسحاق سے لے کر ملہ گولی محمد، ساجدہ، بتول خالہ، سمیت دیگر سب کے سب زیر دست ہیں۔ فن کاروں کی اداکاری لائق توجہ اور قابل داد ہے ،دل پر ہیبت طاری کرنے والی، کاشف نثار کی ڈائریکشن، اور بیک گراونڈ میوزک کا بھی نہایت اہم کردار ہے۔ مثلا بیک گراونڈ میوزک کا اہم رول یہ ہے کہ فنی نزاکتوں کی سمجھ رکھنے اور مشکل ڈرامہ کو دیکھنے کا ذوق نہ رکھنے والے عام سامعین کو، بیک گراونڈ میوزک کا اتار چڑھاو، کہانی کی سنگینی کو سمجھنے میں مدد دیے رہا ہے۔

انسان کی سیاہ کاریوں اور گراوٹ کی حد کیا ہو سکتی ہے اور اس کے نتائج کہاں تک جا سکتے ہیں، آپ اس ڈرامے میں ملاحظہ کریں گے۔ نسل در نسل دشمنی نبھانے کی رسم، دھوکا اور فریب سے گھر کے معصوم افراد کے اعتبار کا خون، عقیدے کی کمزوریاں، جادو، پیری مریدی کا ڈھونگ، توہم پرستی، حسد و جلن، تکبر اور سرکشی، منافقت اور پیٹھ میں چھرا گھونپنا سب عوامل کہانی میں یکجا ہیں۔

نسوانیت ازم پر تنقید کرنے والے سیکولر اور مذہبی لوگ اس ڈرامے کے توسط سے شائد اس حقیقت تک رسائی حاصل کریں کہ چند دہائیوں پہلے وہ کون سے عذاب تھے جو ایک عورت پہ ٹوٹتے تھے، جن کے بعد اس کو کراہنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ جب اپنی زندگی جینے کا ہر دروازہ عورتوں پہ بند ہوا ہو گا تو ہی یہ فیمینیسٹ تحریک کا طوفان چلا ہو گا۔ آج یہ فتویٰ پڑھ کر افسوس تو کرتے ہیں کہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت اس لیے نہیں تھی کہ قراء کی

ڈرامے پر تبصرہ

خوش الحان آواز سے عورت دل پھینک بیٹھے گی۔افسوس ہے کہ ماضی میں، صنف نازک کے لئے مجھے اس گھٹیا تر درجے کو ماننا پڑ رہا ہے۔ہاں یہ واقعی ممکن ہے۔ مگر، مگر کب؟ کیسے؟ یہ ڈرامہ آپ کو بتائے گا کہ جب ایک عورت اپنی تعلیم اور شعور کو بلند کر کے بھی، برادری کے انتقام اور جاگیر کی دلدل دھنسادی جائے، خود کو اٹھانے اور زندہ رکھنے کی ہر کوشش اس کو مزید بے بسی کی پاتال میں دھکیلے، اس کے لئے تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہ رہے تو وہ اپنے مقام و مرتبہ اور تعلیم و شعور، اپنی ایثار و وفا کی فطرت کو نظر انداز کرنے پہ آمادہ ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ عورتوں کی بے بسی اور لاچاری کے کئی دل خراش مناظر اور مظاہر سے بھرپور ہے، مثلاً حویلی کی ان بلند دیواروں میں جہاں ایک عورت کے لئے، اپنے عورت ہونے کا احساس رکھنا جرم سمجھا گیا، وہاں معصوم آسیہ، جو اپنی نسوانیت کو سیراب کرنے کے لیے قلعہ نما دیوار میں چھید بنا ڈالتی ہے۔ محض اس لئے کہ حویلی کے ایک نوکر، 'ولی' کو دیکھ سکے۔ جو گاوں میں جادو کے لئے اُلو فروخت کرتا تھا۔

دوسری طرف کنیز فاطمہ کو خاندان کے مردوں نے جائیداد کی ہوس میں، بھری جوانی میں بیوہ کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا۔ مگر وہ بعد میں اپنے جیسی عورتوں کی معالجہ بن گئی۔ایک نازک موڑ پر نفس کی آزمائش میں مبتلا ہو گئی، ایک لمس کی تمنا نے اسے گرداور غلاظت میں لپٹے ملنگ، فقیر، جوگی کے پاس پہچا دیا۔

ڈرامے نے اس پہلو کو بھی بے نقاب کیا کہ کس طرح، ایک مرد کی آزاد شہوت رانی اور آوارہ نظریں، عورت کو ہر وقت کے خطرے سے دوچار کیے رکھتی ہیں کہ وہ اپنے آنگن کی حفاظت کرے۔ المناک صورت حال ہے کہ اپنے مردوں کی جذباتی آوارگی اور برہنہ نظروں کا سدباب کرنے کے لئے، عورت جب مرد کو سمجھانے میں بے بسی و لاچاری کا سامنا کرتی ہے تو اپنا دشمن، دوسری عورتوں کو بنا لیتی ہے۔اپنے بھائی اور شوہر کے دوغلے رویے اور شہوت پرستی کی سزا، گھر کی باندیوں کو ملی۔ کوئی چوڑیاں پیس کے کھا گئی تو کسی کو گنجا کر کے ذلیل کیا گیا۔

آج کی عورت کو یہ سمجھنا ہے کہ عورت، جب تک عورت سے دشمنی کرتی رہے گی، تب تک اپنے بیٹوں اور مردوں کی جنسی آوارگی کی تربیت و تہذیب کرنے سے قاصر رہے گی۔اس ڈرامے نے معاشرے کے نازک اور سنگین مسئلوں کو ادبی ذوق میں عیاں کیا۔ تعلیم یافتہ پروفیسر سے لے کر جاگیرداروں کے ہاں، بیویوں کی حق تلفی، مال و زر کے بڑھاوے اور بادشاہت کی خاطر کمزور عورت کی قربانی و محکومیت کے دردناک قصے، جیتے جی ایک عورت سے اس کی شناخت کو چھیننا بلکہ مسخ کرنے، شادی کی طبعی ضرورت سے محروم کرنے کے بعد کس قسم کی تباہیاں در آتی ہیں۔ یہ ستم کہ جب انسانوں سے ان کی زندگی کی حسین صبحیں اور شامیں، ان کا ارادہ و اختیار چھین لیا

جاتا ہے تو کس کس قسم کے المناک واقعات، فرار کی گھٹیا کوششوں اور نفسیاتی بیماریوں کا دروازہ کھلتا ہے۔ کس طرح وہاں جنات، لڑکیوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور کس طرح ان کو زنجیریں ڈالی جاتی ہیں۔

ڈرامے کی ایک خوبصورتی اس میں علامتیں اور استعارے ہیں۔ مثلاً 'کنیز فاطمہ' پہ جِنّ آنے کی صورت میں، ڈراونی، جِنّاتی آواز میں نکلنا "میں ایک عورت ہوں، میں ایک عورت ہوں" ڈرامے کا ماحاصل ہے۔ اُلو، شطرنج کے مہرے، کبوتر، اور پَر۔۔۔ ان سب کی ڈرامے میں خاص اہمیت ہے۔

آخری قسط، قارئین کے فہم کا امتحان ہے۔ اسی نے اس ڈرامے کو ایک نئی شناخت دی ہے۔

مرتب: وجیہہ حسان واحدی

نامے جو میرے نام آئے!

یہ قارئین کے برقی خطوط اور پیغامات ہیں جو انھوں نے ہمیں ارسال کیے۔
قارئین وسامعین اس پتے پر اپنی آراء، تجاویز اور تحریریں بھیج سکتے ہیں:
آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی بھیج سکتے ہیں۔

Salihaat@almawridus.org

فابیہ احسان

ثوبیہ نورین کے تربیت والدین کے مضمون پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتی ہیں: رسالے میں آپ کی یہ تحریر پڑھی ہے، بہت عمدہ انداز میں آپ نے مثبت انداز فکر اپنانے کی مشق بتائی ہے۔ اللہ آپ کو برکت دے۔

ظفر شبیر

ثوبیہ نورین کے آرٹیکل کے بارے میں لکھتے ہیں: ایک فکر انگیز تحریر۔ کانٹریبیوٹ کرتی رہیں۔ ڈھیرں دعائیں۔

نادرہ زیدی

شفاءبنت عبد اللہ کے بارے میں لکھتی ہیں: آپ نے موضوع کو بہت اچھی طرح سے لکھا ہے۔ شکریہ اس بات کا کہ آپ سب ایسے آرٹیکلز لکھ رہے ہیں جو اہم ہیں۔ خواتین لیڈرز پر آرٹیکل، پڑھنے والوں پر ایک مثبت احساس ڈالتا ہے۔

فوزیہ نورین

تربیت الدین کے مضمون بارے لکھتی ہیں کہ آپ نے سرکل آف انفلوئنس اور سرکل آف کنٹرول کو بہت اچھی طرح سمجھایا ہے۔ ہم سب کو اپنے ریموٹ کنٹرول کو واپس اپنے ہاتھ میں لینا ہو گا۔

نزہت فاطمہ (بحرین)

بچوں سے قرآن حفظ کرانا کے آرٹیکل پر لکھتی ہیں:

تاثرات

یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کا لوگوں کو اور خاص طور سے والدین کو ادراک نہیں ہے۔ اس اہم مسئلے کو عرفان شہزاد صاحب نے اپنے مضمون میں بہت اچھی طرح سے اجاگر کیا ہے۔

مصنف نے اپنے مضمون میں بچوں کی بے بسی اور بے کسی کو بھرپور طریقے سے نمایاں کیا ہے جس سے بڑی دلخراش حقیقت سامنے آتی ہے۔ انہوں نے قرآنی آیات، مستند احادیث اور مضبوط دلائل سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ والدین اپنے جگر گوشوں کو اپنے سے دور کر کے مدرسوں میں بھیج دیتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ چند ضعیف احادیث سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ اگر وہ اپنی اولاد کو حافظ قرآن بنا دیں گے تو ان کی اولاد اپنے والدین کو جنت میں لے جانے کا ذریعہ بن جائے گی۔ دین اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر جنت میں جانے کا یہ شارٹ کٹ بہت ہی پر کشش معلوم ہوتا ہے۔ والدین خود تو چند سورتیں بھی حفظ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور اپنے بچوں سے ان کی مرضی، صلاحیت اور شوق جانے بغیر مکمل قرآن حفظ کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

والدین اس بات سے بھی غفلت میں ہیں کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حافظ اس کو کہا جاتا تھا جس کے حافظے میں قرآن کے الفاظ کے ساتھ قرآن کا علم بھی حافظے میں محفوظ ہوتا تھا۔ وہاں ہر حافظ اس کا مطلب جانتا تھا کیونکہ وہ عربی سے واقف تھا۔ اسی لیے قرآن کا عکس اس کی پوری زندگی کے عمل میں نمایاں ہوتا تھا، وہ حافظ قرآن کہلاتا تھا۔

میرا اس مضمون کے بارے میں اظہار خیال کرنے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ میں حفظ کرنے کے خلاف ہوں۔ میں ظلم و جبر کے خلاف ہوں۔ بچوں کے حوالے سے میں زیادہ حساس اس لئے ہوں کہ وہ کمزور ہوتے ہیں اور اپنی بات بھی نہیں سمجھا سکتے اور نہ ہی اپنے اوپر ہونے والے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں۔ اس لئے معاشرے میں اس شعور کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر عرفان شہزاد صاحب کا یہ مضمون اس سلسلے میں کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے۔ رہی بات حفظ قرآن کی تو یہ روایت تو مسلمانوں کا ایک غیر معمولی امتیاز ہے۔ اور حفظ کی اس روایت کو قائم رہنا چاہیے۔ اللہ کی کتاب کا کچھ نہ کچھ حصہ تو حافظے میں محفوظ رہنا ہی چاہیے، کیونکہ فجر، مغرب اور عشا کی نمازوں میں جہری تلاوت ہوتی ہے اور ماہ رمضان میں تراویح کہ اندر طویل قرات کی جاتی ہے۔ اس لیے حفظ کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حفظ قرآن کے سلسلے میں توازن کیسے قائم کیا جائے اور بچوں پر مدرسوں میں

جو ظلم وزیادتی ہوتی ہے۔اس کا سد باب کیسے کیا جائے ؟اس سلسلے میں میری گزارشات مندجہ ذیل ہیں۔

معاشرے کو شعور دینے کی ضرورت ہے،تب ہی والدین کو بھی اس بات کا آگہی ہو گی کہ اپنی بخشش کے لئے بچے کو حفظ نہیں کروانا بلکہ اپنے بچے کا میلان دیکھنا ہے،اس کے شوق اور صلاحیت کا جائزہ لینا ہے کہ کیا اس کے اندر اتنی استعداد موجود ہے کہ وہ مکمل قرآن حفظ کر سکے۔

اس سلسلے میں تعلیمی نفسیات کے ماہرین سے ان کی خدمات لی جاسکتی ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ بچے کا اہلیت ہے یا نہیں ؟ بچے کی عمر کا لحاظ رکھنا چاہیے ۔ بچہ بہت چھوٹا نہ ہو،اس کی عمر 18 سال ہو اور وہ اسکول کی 12 جماعتیں مکمل کر چکا ہو۔

اگر بچہ خود حفظ کا بہت زیادہ شوق رکھتا ہو تو اس کی کم از کم عمر 9 یا 10 سال ہونی چاہیے۔(اس سلسلے میں تعلیمی نفسیات کے ماہرین رہنمائی کر سکتے ہیں)

جس جگہ یا جس ادارے میں بچے کو حفظ کروانے کے لئے بھیجا جائے وہاں کا ماحول اچھا ہو،خوشگوار ہو اور اس کی حفاظت کے بارے میں پورا اطمینان ہو۔پڑھائی یا حفظ کا دورانیہ چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ہو،بچے پر حفظ کے لیے کوئی دباؤ نہ ہو ورنہ اس کتاب سے روحانی تعلق کے بجائے اس میں بیزاری پیدا ہو سکتی ہے،اور وہ دین ہی سے متنفر ہو سکتا ہے۔اور یہ بات اس بچے کے مستقبل، دنیا اور آخرت کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

قران کریم حفظ کرانے کے لیے ایسے مراکز کھولے جائیں جن کا معیار اعلیٰ ہو اور آج کل کے اچھے سکولوں کے ہم پلہ ہو۔ان تمام چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر بچہ اپنے شوق سے حفظ کرنے کو تیار ہے تب ہی اس کو حفظ قرآن کروانا چاہیے اور اس مقام پر اس کی حوصلہ افزائی ضرور کرنی چاہئے۔قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔اس کو سکھانے اور حفظ کرانے کے لیے غیر معمولی اہتمام تو ہونا ہی چاہیے۔

نشاط رحمان

نعیم بلوچ کے افسانے "سوالوں کا جنگل" پر حلقہ ارباب ذوق انٹر نیشنل پر صدر محفل نے یہ تبصرہ لکھا:

تاثرات

افسانہ "سوالوں کا جنگل" ایک علامتی تحریر ہے جس کا بنیادی موضوع وہ سوالات ہیں جو جنت، دوزخ اور قرآن پاک میں بیان کردہ واقعات کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جن کے تشفی بخش جواب ہمیں نہیں ملتے تو ہم پراگندہ ذہنی اور پریشاں خیالی کا شکار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے چند ضمنی موضوعات کو بھی چھوا ہے جیسے ماں کے لئے اولاد کی محبت ،اللہ کے نزدیک پسندیدگی صرف مذہبی وابستگی ہی نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت بھی ہے۔ ایک موضوع فیمنزم بھی ہے لیکن فیمنزم ان معنوں میں نہیں کہ عورت کی آزادی، خود مختاری، بے جا پابندی وغیرہ بلکہ یہ فیمنزم ایک شکوے شکایت کی طرز کا ہے کہ عورت اتنی ذمہ داریاں ادا کرتی ہے، گھریلو مسائل کا سامنا کرتی ہے لیکن مرد کی طرف سے کوئی تعریف، توجہ یا حوصلہ افزائی نہیں ملتی۔ ایک اچھے افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی لفظ، جملہ، کردار ،وقوعہ اضافی یا غیر ضروری نہیں ہوتا۔ اس افسانے میں یہ خوبی موجود ہے۔ مصنف نے جن موضوعات کو بیان کیا ہے انہیں استعاروں اور علامات کے ذریعے سے قاری تک پہنچایا ہے۔ کانٹے دار سوالات کے علاوہ ایک موضوع یہ بھی ہے کہ ہم اس جدید ٹیکنالوجی اور میڈیکل سائنس کے دور میں بھی اپنی پریشانیوں اور طبّی مسائل کے حل کے لئے چلوں، وظیفوں اور تعویذ گنڈوں سے رجوع کرتے ہیں۔ افسانے کا مرکزی کردار انیقہ ہے جو بنیادی طور پر ایک موڈی، روشن خیال، تفریح اور پارٹیوں کی شوقین لڑکی ہے لیکن اولاد کی خواہش اور اس کی سلامتی کی خاطر مذہبی بن جاتی ہے لیکن دل سے مذہبی نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مذہب کے حوالے سے سوالات اسے پریشان رکھتے ہیں۔ انیقہ کے خسر اسے مذہب کی طرف راغب کرتے ہیں ان کا کردار انیقہ کے سسرال کا مذہبی سوچ کا نمائندہ ہے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے بغیر کسی تفصیلی بیان کے محض کرداروں کے ذریعے اور علامتوں استعاروں کی مدد سے بہت سے موضوعات کو بیان کر دیا ہے۔ افسانے کا سب سے دلچسپ کردار ڈنمارک سے آئی ہوئی اس لڑکی کا ہے جس نے درس قرآن کی محفل میں یہ چبھتے ہوئے سوال اٹھائے ہیں۔

انیقہ اس بات کی بھی خواہش مند ہے کے اس کا شوہر اس کے مسائل اور اکلوتے بیٹے دانش کی سلامتی کے لئے کی جانے والی کوشش میں اس کا ساتھ دے اسے سپورٹ کرے اور اس کی حوصلہ افزائی کرے لیکن اس کا شوہر اس سے لاتعلق اور ناراض سا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ ہوا ہے۔

افسانے چار اور کردار رتھ فائو، میری کیوری،، مدر ٹریسا اور بلقیس ایدھی اس سوچ کی علامت کہ انسانیت

کی خدمت اور انسانوں سے ہمدردی بھی اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل ہے۔افسانے کا کلائمکس وہ ہے جب انیقہ تھک کر سو جاتی ہے اور خواب میں رنگوں، خوشبوؤں، پھولوں کی ایک خوبصورت دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں سکون ہے، من پسند کھانے ہیں طمانیت ہے۔افسانے کا اختتام بہت بھرپور علامتی اور پیغام رساں ہے۔ اس میں بستر کے قریب تپائی پر رکھا قرآن، شوہر راشد کا گرتے قرآن کو سنبھالنا اور چومنا اور انیقہ کا اس ڈنمارک والی فرضی لڑکی پر ہاتھ اٹھانا اور انیقہ کا یہ کہنا کہ میری آنکھیں کھل گئیں بہت معنی خیز ہے اور یہی اس افسانے کا موضوع بھی ہے۔یہاں دو اشارے اور بھی ہیں۔ایک یہ کہ انیقہ کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب قرآن ہی سے مل سکتے ہیں اگر دل اور خلوص نیت سے پڑھا جائے دوسرا یہ کہ انیقہ کو اس کے شوہر کی سپورٹ بھی مل گئی۔ انیقہ کا یہ کہنا کہ میری آنکھیں کھل گئیں بہت معنی خیز ہے۔۔۔۔۔اب چند نکات تحریر کے حوالے سے اول تو یہ کہ ایسے موضوعات پر بہت سوچ سمجھ کر قلم اٹھانا چاہیے۔یہ ایسے سوالات ہیں جن پر نجی محفل میں کسی عالم دین کے ساتھ تو گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن ان پر عام قاری کو بحث کی دعوت دینا گویا متنازع مباحث کو جنم دینا ہے بلکہ کسی کی دل آزاری کا احتمال بھی ہے۔ تحریر میں چند باتیں محل نظر بھی ہیں جیسے جنت میں مردوں کے مشاغل کو عیاشیاں اور بدمستیاں کہنا۔ حضرت ابرہیم ،بی بی حاجرہ، حضرت عیسی کے اسمائے گرامی احترام کے کسی لاحقے کے بغیر صرف نام لکھ کر ذکر کرنا۔وغیرہ۔